جلد ۷ | جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ء | شمارہ ۴، ۵

مجلسِ ادارت

نورالحسن نقوی　اطہر پرویز

اسدیار خاں

مینجنگ ایڈیٹر

احمد سعید خاں

زرسالانہ ---- ۱۶ سولہ روپے
قیمت ---- تین روپے

پرنٹر پبلشر ---- اسدیار خاں
مطبوعہ ---- جواہر آفسیٹ پریس، نئی دہلی
کتابت ---- ز۔ رشید، الہ آباد

مقام اشاعت
ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سرورق کی تصویر: جرش

پتہ: دوماہی الفاظ ایجوکیشنل بک ہاؤس
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
فون نمبر ۲۷۶۸

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

آئینہ

گوشۂ جوش

طنز و مزاح

افسانے

منظومات

○

○

گوپی چند نارنگ

صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی

شاعرِ حریت و فطرت ۔۔ جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی (۱۹۸۲ ۔ ۱۸۹۸) بیسویں صدی کے ان باکمال شاعروں میں سے تھے، جن کی نظیر زمانہ پھر پیدا نہیں کر سکے گا۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک پورے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت تک جوش نے اپنی شاعری کا جزر و مد اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ قبول عام و لطف سخن کو خداداد کہا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ تخلیقیت خواہ وہ کسی طرح کی ہو، اس کا گہرا تعلق وہبی صلاحیت سے ہے۔ قبول عام میں تو پھر بھی زمانے کی روش، مذاق و معیار، نیز شخصیت کے بانکپن یا باالعجبی (ECCENTRICITY) کا کچھ نہ کچھ دخل ضرور رہتا ہوگا، لیکن لطف سخن تو تمام و کمال اس تخلیقی اُپج کے فروغ سے عبارت ہے جو شاعر کے عہد میں یا اس کے بعد حلقۂ شام و سحر سے آزاد ہونے یا جاوداں ہونے کی قوت رکھتا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ بیسویں صدی میں ٹیگور اور اقبال کے بعد جتنی عزت، شہرت اور مقبولیت جوش کو نصیب ہوئی، کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ۱۹۵۶ء میں جب جوش نے ہجرت کی، تو دونوں ملکوں یعنی پورے برصغیر کے طول و عرض میں جوش کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ کیا یہ امر غور طلب نہیں کہ قطع نظر اس ذاتی واقعے کے بیانیہ شاعری کا وہ انداز جس کے جوش اتنے زبردست ترجمان تھے، تاریخی اعتبار سے اس کے خاتمہ ہونے کا اعزاز بھی انھیں کو نصیب ہونے والا تھا کیوں کہ آزادی کے بعد کے چند برسوں میں کیا یہ انداز اپنی بساط تہہ نہیں کر رہا تھا جب زمانہ بدلتا ہے تو مذاق بھی بدلتے ہیں۔ ادبی تبدیلیاں اگرچہ خاموشی سے رونما ہوتی ہیں، لیکن کئی بار یہ سیاسی طوفانوں اور تسکوں سے کم ہوش ربا اور روح فرسا نہیں ہوتیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ آزادی کی ایک دہائی کے اندر اندر ہی پاکستان اور ہندوستان میں اردو شعر و ادب کی سطح پر دوررس تبدیلیوں کے آثار سامنے آنے لگے۔ چنانچہ جب مذاق بدلنے لگا تو انقلاب کی صدا لگانے والے خود ایک انقلاب کی زد میں آ گئے۔ ہماری شاعری کی حالیہ تاریخ ان تبدیلیوں کی خاموش تماشائی ہے جوش نصیحت نیوش ہو یا نہ ہو، دیدۂ عبرت نگاہ تو خون کے آنسو رو بھی چکی اور رلا بھی چکی۔

جوشؔ اس قدر جلد روایت پارینہ بن جائیں گے، آج سے پچیس برس پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاہم وہ ہماری کتاب شعر کا ایسا باب ہیں جس کے بعض نقوش کی چمک آسانی سے ماند نہ ہوگی۔ جوشؔ کی اٹھان میں بلا کا زور تھا۔ انھوں نے اپنا تخلص جوشؔ بلا وجہ اختیار نہ کیا ہوگا، غالباً اپنی فطرت کے ہیجان انگیز عناصر کا انھیں شروع ہی سے شدید احساس تھا۔ ان کے یہاں ابتدا ہی سے ایک زبردست قوتِ نمو۔ تخلیقی اپج، پھوٹ پڑنے اور بے اختیارانہ بہائے جانے کی کیفیت ملتی ہے۔ وہ ایک بگولے کی طرح اٹھے اور طوفان بن کر چھاگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنی تہلکہ خیزیوں سے ایوان شعر کے در و دیوار کو لرزا دیا۔ وہ سر تا سر ایک رومانی شاعر تھے اور شدید باغی، ایسا باغی جو بالآخر خود اپنی ہی آگ کی نذر ہوگیا۔ مشاقی، بدگوئی، شوکت الفاظ اور قادر الکلامی ان پر ختم تھی۔ ان کی شاعری سے لگتا ہے کہ وہ جس موضوع یا منظر کو جیسا چاہتے آناً فاناً نظم کر دیتے تھے۔ لفظوں کا ایسا بڑا جادوگر انیسؔ کے بعد دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ زبان کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی حاکمانہ اور آمرانہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں الفاظ قطار اندر قطار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں اور ادنیٰ سا اشارہ پاتے ہی سر جھکائے شعر میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ جوشؔ کے لہجے میں ایسا طنطنہ اور مردانگی تھی اور ان کی آواز میں ایسی گھن گرج، کڑک اور دبدبہ تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہمالیہ لرز رہا ہے یا زلزلہ آگیا ہے۔ "شعلہ و شبنم" کے بعد ان کا یہ شعر بلا وجہ زبان زد خاص و عام نہیں ہوگیا تھا:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

یوں وہ شاعر انقلاب کے ساتھ ساتھ شاعر شباب بھی کہے جانے لگے۔ بیک وقت شاعر انقلاب اور شاعر شباب ہونا جوشؔ ہی کا کمال تھا۔ تضاد کا یہ سلسلہ جوشؔ کی پوری شاعری میں ملتا ہے۔ جوشؔ کو اس پر فخر بھی تھا۔ انھوں نے اپنے مجموعوں کے نام 'شعلہ و شبنم، سنبل و سلاسل، سیف و سبو، حرف و حکایت، فکر و نشاط، جنون و حکمت، سرود و خروش، الہام و افکار، عرش و فرش، آیات و نغمات، سموم و صبا بلا وجہ نہیں رکھے۔ جوشؔ کی پوری شاعری میں یہی کیفیت ہے کہ ایک جذبہ دوسرے کی نفی کرتا ہے اور ایک رنگ دوسرے کو بے رحمی سے کاٹتا ہے۔ لیکن جوشؔ اب پل کے دوسری طرف جاچکے ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ وقت کے اس خلات میں ان کی شاعری کا جو چہرہ ابھرتا ہے، وہ کیسا ہے، اور صرصر و سموم کے اس دشت سے گزرنے کے بعد جس کا نام دنیا ہے، جوشؔ کی شاعری کے وہ کون سے نقوش ہیں جو اب بھی روشن ہیں۔

اس کے جواب کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ جوشؔ اپنے وقت سے آگے نہ سہی، اپنے وقت کی آواز ضرور تھے اور یہ سعادت معمولی نہیں۔ خلافت تحریک اور اس کے بعد سے یہ برصغیر سیاسی بیداری اور قومی جوش و خروش کے جس ابال سے گزر رہا تھا، جوشؔ کی شاعری اس کی فطری نقیب بن گئی تھی۔ آزادی کے ترانے چھیڑنے والوں میں جوشؔ اکیلے نہیں تھے۔ شبلیؔ، حسرتؔ موہانی چکبستؔ، اکبرؔ الہ آبادی، اقبالؔ، ظفر علی خاں، اقبالؔ سہیل اور کئی دوسرے شعرا سامراج دشمنی کی فضا تیار کر چکے تھے۔ لیکن جوشؔ کی آواز جوشؔ کی آواز تھی۔ ان کی باغیانہ تڑپ اور گھن گرج سب سے الگ تھی۔ شاعرِ انقلاب کہلانے کا اعزاز کسی کو ملا تو صرف جوشؔ کو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ شاعری کی سطح پر ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے قافلہ سالاروں میں سے تھے اور جس مجاہدانہ جوش و خروش اور ہمت و پامردی سے انھوں نے سامراج دشمنی اور انقلاب کے ترانے گائے اور انگریز کے خلاف بغاوت کی آگ کو سینوں میں دہکایا، وہ دونوں ملکوں کی قومی تاریخ کا حصہ ہے۔ رہا شاعرِ شباب کا معاملہ تو وہ ذرا کمزور ہے۔ ان کی شدید جذباتیت سے شاید جتنا فائدہ ان کی انقلابیت اور بغاوت پسندی کو پہنچا، اس نسبت سے اتنا یا اس سے زیادہ نقصان ان کی عشقیہ شاعری کو پہنچا جسم و جمال کے تذکروں میں لذت اندوزی اور ہوس پرستی سے آگے نہ دیکھ سکنے کی وجہ بھی یہی تھی۔ جوشؔ کا عورت کا تصور محدود اور فرسودہ تھا۔ تاہم باغیانہ لے سے ہٹ کر ان کی شاعری کا اگر کوئی اور روشن پہلو ہو سکتا ہے وہ تو ان کا حسنِ فطرت سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ لگتا ہے قدرتی مناظر کی کشش سے ان پر ربودگی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ انھوں نے فطرت کے حسن و جمال کے جو مرقعے کھینچے ہیں اور البیلی صبحوں، ڈھلتی شاموں، ساون کے مہینوں، اور گرجتی برستی گھٹاؤں سے آواز کی بیڑھیوں کے ذریعہ جو باتیں کی ہیں اور دن، رات، لو، گرمی، تپش، بہار اور برسات کی جو کیفیتیں بیان کی ہیں، وہ پوری اردو شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ جوشؔ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اتنی توجہ نہیں ہوئی جتنی اس کا حق ہے۔ یہاں ان دونوں پہلوؤں کا مختصراً تذکرہ کیا جائے گا، اور ان اسلوبیاتی جہات کی طرف بھی اشارہ کیا جائے گا۔ جو جوشؔ کی شاعری کا امتیازی نشان ہیں۔

جوشؔ کی باغیانہ شاعری کے تین پہلو خاص ہیں۔

عوامی سماجی پہلو جہاں انھوں نے سماج کی خرابیاں دکھائی ہیں اور عوام کی حالت بیان کی ہے۔ دوسرے وہ نظمیں جن میں انھوں نے بغاوت و آزادی کے ترانے چھیڑے ہیں، اور تیسرے وہ نظمیں جن میں سامراج دشمنی کا کھل کر اظہار ہوا ہے۔ ان میں ہر ہر سطح کا تفصیلی تجزیہ ممکن نہ ہوگا، بعض

جگہ صرف اشاروں سے کام لیا جائے گا۔ جوش کی باغیانہ شاعری میں عوامی سماجی پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ہمارے پہلے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے بغیر کسی خارجی سہارے کے انسان کی مرکزیت کو تسلیم کیا اور اسے انقلاب کی پہلی اور بنیادی کڑی کے طور پر پیش کیا۔ وہ اس نئے انسان کی بشارت دیتے ہیں۔ جسے اپنی قوت پر بھروسا ہے اور جو سامراج سے ٹکر لینے کے عزم و ولولے سے سرشار ہے۔ ترقی پسند تحریک کی سالاری بعد کی چیز ہے۔ اس نوع کے جذبات جوش کے یہاں ترقی پسند تحریک کے آغاز سے دس پندرہ برس پہلے یعنی ۱۹۲۱۔ ۱۹۲۲ سے ملنے لگے تھے۔ "انسان کا ترانہ" "باغی انسان" "پست قوم" "جھریاں" "مہاجن اور مفلس" "ضعیفہ" "بھوکا ہندوستان" اور بالخصوص "کسان" اور "ہماری سوسائٹی" اور اس طرح کی دوسری نظموں میں جوش نے برصغیر کے عوامی دکھ درد، افلاس، ناداری اور جہالت کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور ہم وطنوں کو بیدار کرنے کے لئے ان کی غیرت کو للکارا ہے۔ باستثنائے "کسان" اور "ہماری سوسائٹی" جو اعلیٰ پائے کی نظمیں ہیں۔ دوسری عوامی سماجی نظموں میں دو کمیاں خاص طور پر کھٹکتی ہیں۔ اول تو جوش جہاں کبھی عورت کو دیکھتے ہیں، ان کی انقلابیت شبستان طرب میں پہنچ جاتی ہے۔ "حسن اور مزدوری" کا شمار بعض نرم دل حضرات جوش کی بہترین نظموں میں کرتے ہیں۔ اس کے جذبۂ عوام دوستی اور وطنیت میں کلام نہیں۔ ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں پتھر توڑ رہی ہے۔ رخساروں پر گرد ہے اور زلفیں چاک میں اٹی ہوئی ہیں۔ چوڑیوں کے ساز میں سوز بھرا ہوا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر شاعر کے دل سے دھواں اٹھتا ہے اور وہ افلاس کے مارے ہوئے ہندوستان پر افسوس کرتا ہے۔ لیکن اس جذبۂ وطنیت کی تان بالآخر اس خیال پر ٹوٹتی ہے:

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہئے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہئے

دوسرے یہ کہ عوام سے خطاب کرتے ہوئے اکثر جوش کا لہجہ اتنا تلخ ہو جاتا ہے کہ ان کی ہمدردی اور خلوص پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ اتنی بات واضح ہے کہ جوش کا تصور سماج کسی سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں تھا۔ وہ ہر چیز کو ذاتی برتری کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس میں کچھ ہاتھ ان کے رئیسانہ مزاج اور خاندانی وجاہت کا بھی تھا۔ ایک جگہ کہا ہے کہ "ہند کے غلامانہ روسیاہ" شاعر سے نگاہ ملانے کے قابل ہی نہیں۔ "فرنگی کے غلام" "روسیاہ" "کمینے" "وحشی" "بے حیا" "بدگمان" جیسے الفاظ جوش کے نوک زبان تھے۔ وہ اکثر گلہ کرتے تھے کہ وہ "نامرد قوم" میں پیدا ہی کیوں ہوئے "غلاموں سے خطاب" ایسے مقامات پر ان کا رویہ اپنے ہم وطنوں کے لئے اہانت آمیز ہو جاتا ہے۔ اصلاً ایسا

وہ غیرت دلانے اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے کرتے تھے، لیکن غیظ و غضب سے شعر پایۂ اعتبار سے فروتر ہو جاتا تھا۔ جوش کی عوامی سماجی نظموں سے وہ نظمیں کہیں بہتر ہیں جن میں انھوں نے آزادی اور بغاوت کے ترانے گائے ہیں اور انقلاب کے لئے بیدار کیا ہے۔ جوش کے لہجے میں جو مردانگی شکوہ، بلند آہنگی اور طنطنہ تھا، وہ جذبۂ بغاوت اور آزادی کی تڑپ کے اظہار سے خاص مناسبت رکھتا تھا۔ جوش کی آواز کی للکار اور کڑک ولولوں کو بڑھانے اور ہمتوں کو بلند کرنے کے لئے آگ کا کام کرتی تھی۔ نعرۂ شباب میں کہتے ہیں:

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ "انقلاب" و "انقلاب" و "انقلاب"
رنگ سورج کا اڑاتا ہے مرے سینے کا داغ
باد سرسر کا بدل دیتا ہے رخ میرا چراغ
تیر جاتی ہے دل فولاد میں میری نظر
خون میرا خندہ زن رہتا ہے موج برق پر
ایک دین نو کی لکھوں گا کتاب زر فشاں
ثبت ہوگا جس کی زرّیں جلد پر "ہندوستان"
پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا
ولولوں سے، برق کے مانند لہرایا ہوا
موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھایا ہوا

ایسی نظموں میں "سلام" "بغاوت" "ناخدا کہاں ہے" "بیدار ہو بیدار" "پیدا کر" اور "نظام نو" میں آزادی اور بغاوت کی آگ بھری ہوئی ہے ان سے آج بھی اس پر آشوب عہد کی ولولہ خیزیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

بھرا ہوا غیظ میں سمندر فضا کی جانب ہمک رہا ہے
گرج ہے، کڑک ہے، کڑک چمک ہے، چمک ہوا ہے، ہوا گھٹا ہے
جھنن جھنن ہے گھڑڑ گھڑڑ ہے، گھنن گھنن ہے دنا دنا ہے
فلک کے ہونٹوں پہ الحذر ہے، زمین کے لب پہ الاماں ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

(ناخدا کہاں ہے)

اٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر
نظام کہنۂ نیلی رواق، وہم و فریب
نیا تصور لیل و نہار پیدا کر
بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

(پیدا کر)

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو
کانٹوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں
بالش کا اشتیاق، نہ بستر کی آرزو

(سلام)

ہاں بغاوت، آگ، بجلی، موت آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل، میری جلو میں قتل عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اٹھتی ہے مری چین جبیں سے کائنات
ذکر ہوتا ہے مرا پر ہول پیکاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
اللہ اللہ کروٹیں میرے دل آزاد کی
جن سے گر جاتی ہیں ڈاٹیں قصرِ استبداد کی
میری اک جنبش سے ہوتا ہے جہاں زیر و زبر
میری سرتابی ثریا کا جھکا دیتی ہے سر
الحذر میری کڑک کا زور ہنگام مصاف
صاف پڑ جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف
اللہ اللہ بزمِ ہستی میں مری گل باریاں
ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو، ریزہ ریزہ استخوان
الاماں و الحذر! میری کڑک، میرا جلال
خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں، کٹار
بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہسوار
جنگ کی صورت سے گر ہنگامہ کرتی ہوں شروع
امن کی صبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلوع
اے جفا پرور امارت! دیکھ ناداروں سے بھاگ
بھاگ، دیوانوں کی خوں آشام تلواروں سے بھاگ
موت کا پیغام ہے بپھرے ہوئے شیروں کا وار
زندگی اکف در دہاں آبادیوں سے ہوشیار
خلق میں بیتاب تیرا منہ جھلسنے کے لئے
تیرے سونے پر ہے اب لوہا برسنے کے لئے
حریت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون؟
جذبۂ خلق خدا کو فتح کر سکتا ہے کون
رعبِ سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں
جو خدائی سے لڑے، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

(بغاوت)

لیکن ان سے بھی زیادہ آگ ان نظموں میں ہے جہاں جوش نے سامراجی نظام پر کھل کر وار کیا ہے۔ ان نظموں میں جوش کے مجاہدانہ تیور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ کھل گیا ہے اور شعلے برس رہے ہیں۔ انھوں نے فرنگیوں کو للکارا ہے اور سامراجی نظام کے پارہ پارہ ہونے کی نوید دی ہے۔ ایسی نظموں میں "زوال جہانبانی" "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام" "وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام" اور "شکست زنداں کا خواب" خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ نظمیں ہیں جنھیں برصغیر کی آزادی کی تاریخ میں ہرگز

ہرگز بھلایا نہیں جا سکے گا۔"وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام" میں طنز کی ایک زیریں لہر ہے جس نے پوری نظم میں تیغ کی آبداری پیدا کر دی ہے۔اس میں ہندوستان کے مجبور دبے بس عوام کی زبان میں انگریزوں سے بظاہر ڈرتے ڈرتے خطاب کیا ہے لیکن درپردہ ایسا طنز کیا ہے جس کا وار نہایت گہرا ہے۔اس سلسلے کی بہترین نظم بلاشبہ "شکست زنداں کا خواب" ہے۔یہ پوری نظم آزادی سے پہلے کے ابلتے کھولتے ہوئے ہندوستان کا استعارہ ہے۔پورا ملک زنداں کا منظر پیش کرتا ہے جہاں بغاوت کا لاوا ابلنے کو ہے۔عوام قیدی ہیں جو دیواروں کے نیچے آ آ کر جمع ہو گئے ہیں، سینوں میں تلاطم اور نظروں میں بجلی ہے۔زنجیروں کی جھنکار بغاوت کا جز بن گئی ہے۔دیوار و در بیٹھ گئے ہیں اور انقلاب نے پرچم کھول دیا ہے۔آٹھ شعروں کی اس مختصر سی نظم میں جوش نے جس طرح جذبۂ حریت کی ہیجان انگیزیوں اور ولولہ خیزیوں کو زندہ جاوید کر دیا ہے، انھیں کا حصّہ ہے:

کیا ہند کا زنداں جاگ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی شوخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا ان کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی، سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی، ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو، کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

یہاں کچھ اشارے جوش کے تخلیقی اظہار کے اسلوبیاتی پیرایوں سے متعلق بھی ضروری ہیں جوش نے یوں تو اپنی نظموں میں مختلف ہیئتوں سے کام لیا ہے لیکن قصیدے اور مسدس کی روح ان کی پوری نظم نگاری کو سرشار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سلام، مراثی، منقبت سے دور اول میں تخلیقی ربط رہا، پھر برسوں کے فصل کے بعد انھوں نے اسے "طلوع فکر" کے ذریعے جوڑا۔ اس ٹوٹتے جڑتے ہوئے سلسلے کے باوصف انیس کی شعری روایت سے جوش کا جو تخلیقی رشتہ تھا۔ اور جس طرح انھوں نے شعری وغیر شعری طور پر اس سے استفادہ کیا، وہ مطالعات جوش کا ایک الگ باب ہے۔ قصیدے اور مسدس کی ہیئتوں میں جو اسلوبیاتی ربط ہے، اس سے میں اپنے مضمون "اسلوبیات انیس" میں بحث کر چکا ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ جوش نے اپنی خطابت سے ایک طاقت ور حربہ کا کام لیا، اور اپنی جاہدانہ اور بیانیہ شاعری میں ایک خاص شان پیدا کی۔ لیکن جہاں جہاں وہ اظہار کی کشتی کو جذباتیت کے تھپیڑوں کے حوالے کر دیتے ہیں، تکرار لفظی سے ایسی صورت پیدا ہوتی ہے جس سے لفظ سے معنی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور محض لفظیات کی ضربیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں باوصف شدید روانی، برش اور تخلیقی قوت نہ ہو کے نظم معنیاتی طور پر آگے نہیں بڑھتی۔ کیا یہ غور طلب نہیں کہ جوش کے یہاں بہت سے بند یا نظمیں ایسے الفاظ سے شروع ہوتی ہیں جن کی تکرار کو وہ خواہ مخواہ اپنے لئے لازم کر لیتے ہیں، خلاً قسم ان کی جو ہنس کر خون میں اپنے نہاتے ہیں / قسم ان گھن گرج پر ہول توپوں کے دہانے کی / قسم ان غازیوں کی موت سے جو جنگ کرتے ہیں / یا پھر / قسم اس دل کی چسکا ہے جسے صہبا پرستی کا / قسم اس روح کی خو ہے جسے فطرت پرستی کی / قسموں کا یہ اکتا دینے والا سلسلہ شعر در شعر پوری نظم میں جاری رہتا ہے۔ اس طرح اگر کبھی بھولے سے وہ / ساقی / سے خطاب کر لیں تو پھر اسے آسانی سے چھوڑتے نہیں ان کی کئی نظمیں "السلام" سے شروع ہوتی ہیں۔ یہی حال "الحفیظ / الاماں / الحذر / کا بھی ہے ان لفظوں کے صرف میں وہ ایسی فیاضی برتتے ہیں کہ معنیاتی روح متاثر ہوتی ہے اور لفظ باقی رہ جاتے ہیں۔

آخر میں مناظر فطرت سے متعلق جوش کی ان بیانیہ نظموں سے بھی استنباط ضروری ہے جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا تھا، اور جنھیں "منظریہ" کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان نظموں کا ذکر کرتے ہوئے "شکست زنداں کا خواب" اور "وفاداران ازلی کا پیام شہنشاہ ہندوستان کے نام" جیسی باغیانہ نظموں کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے، کیونکہ بیانیہ اسلوبیاتی پیرایہ اور تخلیقی قوت

کا سرشتہ ایک ہی ہے۔ "شکست زنداں کا خواب" ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کے زمانہ عروج میں لکھی گئی تھی۔ اس کے سات سال بعد یعنی ۱۹۲۷ء کی لکھی ہوئی ایک منظریہ نظم کا بند ملاحظہ ہو:

"اٹھو، وہ صبح کا غرفہ کھلا، زنجیر شب ٹوٹی وہ دیکھو پو پھٹے غنچے کھلے، پہلی کرن پھوٹی!"
اٹھو، چونکو، بڑھو، منہ ہاتھ دھو، آنکھوں کو ملِ ڈالو ہوائے انقلاب آنے کو ہے، ہندوستاں والو"

(آثار انقلاب)

اس میں صبح کے غرفے کے کھلنے اور زنجیر شب کے ٹوٹنے سے قطع نظر/اٹھو/دیکھو/چونکو/بڑھو کی گونج سے معاً "شکست زنداں کا خواب" کے آخری شعر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے:

سنبھلو، کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

/سنبھلو/جھپٹو/اٹھو/دوڑو/کیا یا انداز اور حصوصیہ کلمات ایک باغی سالار کی للکار کے غماز ہیں۔ افعال کی یہ یورش جوش کے یہاں کئی جگہ نظر آتی ہے اور ایک خاص کیفیت پیدا کرتی ہے۔ جوش کے یہاں متوازیت (PARALLELISM) ایک خاص جمالیاتی کردار ادا کرتی ہے۔ "بدلی کا چاند" سے یہ منظر دیکھئے:

خورشید، وہ دیکھو ڈوب گیا، ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب، وہ ہلکے بادل سے، چاندی کے ورق برسانے لگا

سمٹی جو گھٹا، تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا، تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا، تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

قافیے ردیف کی فعلیت سے قطع نظر مصرعوں کے اندر کے یہ ٹکڑے غور طلب ہیں۔ //سمٹی جو گھٹا/سنکی جو ہوا// پردہ جو اٹھایا بادل کا/چلمن جو گرائی بدلی کی// ابھرا/الجھا// ڈوبا/سلجھا// یہ ساخت باہم دگر مربوط مصرعوں کی یکساں صرفی مطابقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ فعلیہ متوازیت کس طرح غیر شعوری یا شعوری طور پر تخلیقی عمل کا حصہ بن جاتی ہے اور شعر میں لطف

داثر کا جادو جگاتی ہے۔ اب اس کا دوسرا پہلو بھی دیکھئے۔ ذیل کی شاہکار نظم "روپ متی" کے استعمال کا شاہکار ہے۔ آٹھ اشعار کی اس نظم میں ایک بھی فعل نہیں۔ داخلی ساخت میں فعل کا وجود ہے لیکن خارجی ساخت میں اس کا یکسر حذف ہوا ہے:

رخسار میں شمع کعبہ کی ضو — آنکھوں میں چراغ دیر کی لو
خوش پیکر و خوش جمال و خوش رو — چھٹکی ہوئی چاندنی لب جو
پلکوں کی جھپک میں مسکراہٹ — شعلے کی خفیف تھرتھراہٹ
برسات کی راگنی کی راتیں — غلطیدہ حسین دست و پا میں
انفاس میں کستی کی خوشبو — بنگال کا، انکھڑیوں میں جادو
چہرے پہ شباب کا تلاطم — بت خانے کی صبح کا تبسم
عارض میں دمک، دمک میں ندرت — برسات کے چاند کی لطافت
رس کی بوندیں کہ نرم باتیں! — آواز میں مالوے کی راتیں

بالکل یہی ساختی کیفیت "گرمی اور دیہاتی بازار" کی بھی ہے۔ سارا ڈھانچہ اسما پر ٹِکا ہوا ہے، کہیں کہیں ہونا کی گردان ہے۔ یہ نظم بھی جوش کی شاہکار نظم ہے اور تمام و کمال پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

دوپہر، بازار کا دن، گاؤں کی خلقت کا شور — خون کی پیاسی شعائیں، روح فرسا لو کا زور
آگ کی رو، کاروبار زندگی کا پیچ و تاب — تند شعلے، شوخ ذرے، گرم جھونکے آفتاب
شور، ہل چل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار — بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
کھیسوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس — خربزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رو — کملیوں پر سرخ چاول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذروں کے تشدائد، جھگڑوں کی سختیاں — جھگڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
ماؤں کے کاندھوں پہ بچے، گردنیں ڈالے ہوئے — بھوک کی آنکھوں کے تارے پیاس کے پالے ہوئے
بام و در لرزے ہوئے خورشید کے آفات سے — ہر نفس، اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرات سے
مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے — چلچلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی — پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی

لو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی — دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی — بے مروت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا دم — نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم
ہر روش پر چڑچڑاپن، ہر صدا میں بے رخی — ہر جگر بھنتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ، جیسے روح پر عکس گناہ — تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

ان نظموں کو تمام و کمال پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان سے علاوہ جوش کی قادر الکلامی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانے کے اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے کہ جہاں جوش نے اپنی تخلیقی قوت کو قابو میں رکھا ہے، اور اپنی جذباتیت کو زیر دام لا کر ضبط سے کام لیا ہے، نظم بے مثال ہو گئی ہے اس پایے کی دوسری نظمیں "جادو کی سرزمین" "آواز کی سیڑھیاں" اور "البیلی صبح" ہیں، جو اپنی طرحداری اور حسن کاری میں "گرمی اور دیہاتی بازار" اور "روپ متی" سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر اوراق کی کوتاہ دامانی مانع نہ ہوتی تو ان نظموں کو بھی تمام و کمال پیش کیا جاتا۔ اور ان سے بحث کی جاتی کیوں کہ جب تک ان کا ایک ایک مصرعہ نہ پڑھا جائے، ان کے لطف و اثر کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے، اور یہ معلوم کرنا نہایت دشوار ہے کہ اپنی ایسی نظموں میں جوش نے بیانیہ شاعری کی کن بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ برسات جوش کا پسندیدہ موضوع ہے۔ اس پر جوش نے "بھری برسات کی روح" "برسات کی پہلی گھٹا" "رم جھم" "برسات ہے برسات" "برسات کی چاندنی" "برسات کی شفق" "ساون کے مہینے" بیسیوں نظمیں کہی ہیں۔ یہاں آخر میں ایک چھوٹی سی نظم "برسات کی ایک شام (راجپوتانہ)" پیش کی جاتی ہے جس سے ان تمام باتوں کی توثیق ہو جائے گی جو جوش کی اس پائے کی نظموں کے بارے میں اوپر کہی گئی ہیں۔

خنک ہواؤں میں اٹھتی جوانیوں کا خرام — کنارے دشت میں برسات کی گلابی شام
زمیں کے چہرۂ رنگیں پر آسماں کی ترنگ — خنک ہواؤں کی بھیگی ہوئی تہوں کا رنگ
فلک پہ بازیٔ طفلانہ ابر پاروں کی — ندی کے موڑ میں انگڑائیاں نگاروں کی
ہر ایک ذرے میں ہیجان مست ہونے کا — ذرا سا ریل کی پٹڑی پہ رنگ سونے کا
شفق، ہلال، ندی، رنگ، ابر، سبزہ، ہوا — ہوا میں مور کی آواز، جھینگروں کی صدا
خفیف زمزمہ، امواج کی روانی میں! — فلک پہ رنگ، درختوں کے سائے پانی میں
فضا شگفتہ، گھٹا لالہ گوں، شفق چونچال — ہوا لطیف، زمیں نرم، آسماں سیال

بچھڑ گیا ہوں کسی سے تو کھائے جاتے ہیں
یہ جاں فروز مناظر، کہ دل لبھاتے ہیں

یہ تو جوش پر تحقیق کرنے والے ہی بتائیں گے کہ جوش نے کتنے ہزار اشعار کا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ایک عام تخمینے کے مطابق جوش نے پچاس ہزار اشعار سے کم کیا کہے ہوں گے بیانیہ شاعری میں فیاضی اور فراوانی کی راہیں تو بہر حال کھلی ہی رہتی ہیں۔ قصیدے اور مسدس کی روایت کا شاعر جب کہنے پر آجاتا ہے تو سمجھا یہی جاتا ہے کہ موتیوں کے دریا بہا رہا ہے۔ اور جوش کے مداح انھیں یہ باور کراتے بھی تھے۔ یہی زمانے کا رنگ بھی تھا۔ تاہم اشعار کے اس انبار میں گہرہائے آبدار کی بھی کمی نہیں۔ ایسے مقامات بھی آئے ہیں اور بار بار آئے ہیں جہاں نظم کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے اور اپنی تخلیقی قوت کو قابو میں لاکر جوش نے اپنی قادرالکلامی سے صحیح کام لیا ہے۔ باغیانہ اور منظریہ شاعری میں انھوں نے ایسے ایسے شاہکار چھوڑے ہیں جن کے کلاسیکی رچاؤ، حسن کاری اور تابناکی کے نقش کو زمانہ آسانی سے دھندلا نہ سکے گا۔ "ہماری سوسائٹی" "شکست زنداں کا خواب" وفاداران ازلی کا پیام" "کسان" "گرمی اور دیہاتی بازار" "بدلی کا چاند" "روپ متی" "البیلی صبح" "برسات کی ایک شام" ہماری نظر میں اس پائے کی نظمیں ہیں کہ یہ بیسویں صدی کے اردو نظم کے سخت سے سخت انتخاب میں بھی جگہ پائیں گی، اور ان کے بغیر اردو نظم کی کوئی بحث مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ جوش ایک منفرد شاعر تھے، اپنی آواز کے اعتبار سے بھی، اور مزاج کے اعتبار سے بھی۔ ہر ہر سطح پر انھوں نے مسلمات پر شدید ضرب لگائی۔ ان کے کردار کا روشن ترین پہلو یہی ہے کہ انھوں نے ہر ہر تصور سے بغاوت کی۔ وہ سماج کے بھی باغی تھے، سیاست کے بھی باغی تھے اخلاق کے بھی باغی تھے۔ اور تو اور انھوں نے خود اپنے آپ سے بھی بغاوت کی۔ یعنی ان آدرشوں اور قدروں کو بھی پاش پاش کرنے سے نہیں چوکے جنھیں انھوں نے خود تراشا اور سنوارا تھا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے، اور یہی ان کا المیہ۔ وہ لفظوں میں آگ بھر سکتے تھے اور دلوں میں آگ لگا سکتے تھے۔ جب تک حق گوئی دنیا کی آئین جواں مرداں ہے، اور آزادی و جذبۂ حریت شعور و دانش کی سرفرازی کا نشان ہے، جوش کی باغیانہ اور مجاہدانہ روش اور ان کا انداز کج کلہی اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار رہے گا۔

(کراچی کے پاک و ہند جوش ملیح آبادی مذاکرے میں پڑھا گیا)

□

فارغ بخاری
پشاور (پاکستان)

شعلہ و شبنم

میں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو برِصغیر میں خیبر سے راس کماری تک شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا طوطی بول رہا تھا۔ ویسے طوطی تو اس وقت کئی دوسرے شعراء کے بھی چہک رہے تھے یعنی علامہ اقبال حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، احسان دانش وغیرہ۔ لیکن جوش کی بات کچھ اور تھی، سیاسی طور پر وہ ایسا دور تھا کہ انگریز سامراج کی غاصب حکومت کے خلاف بلاامتیاز مذہب و ملت پوری قوم کے دلوں میں نفرت کی جوالا بھڑک رہی تھی، ملک میں جنگ آزادی پورے عروج پر تھی، اس تحریک کو دبانے کے لئے انگریز حکمرانوں کے ظالمانہ عزائم حرکت میں آگئے تھے، ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا اور حریت پسند نوجوانوں کو جلیانوالہ باغ امرت سر، قصہ خوانی پشاور اور کئی دوسرے شہروں میں گولیوں سے چھلنی کیا جانے لگا۔

اس وقت اس غلام آباد میں جوش ہی اکلوتا شاعر تھا جس کے انقلابی نغموں سے ملک کی فضا گونج رہی تھی، یوں نصف صدی تک اس کی شاعری عوام کے دلوں کی دھڑکن بنی رہی، دوسری جنگ عظیم کے ہنگامہ کارزار میں بھی جب حریت خواہ سیاسی جماعتوں نے ہندوستانی سپاہیوں کی بھرتی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور فرنگی حکومت اپنے اقتدار کا کبھی نہ ڈوبنے والا سورج غروب ہوتا دیکھ کر جوش انتقام میں انتہائی ظالمانہ حربوں پر اتر آئی تو وہ جوش ہی تھا جس نے کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بزدل حکمرانوں کو بری طرح للکارا اور وہ تاریخی نظم لکھی جس کا آخری شعر تھا۔

وقت لکھے گا کہانی اک نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

اور جب کانگرس اور مسلم لیگ کی آویزش سے ملکی آزادی کھٹائی میں پڑتی نظر آئی تو جوش کی حقیقت پسندانہ بصیرت نے بلاجھجک قیام پاکستان کی حمایت میں اپنا زور قلم صرف کیا اور کھلم کھلا اپنی

نظم میں برصغیر کی تقسیم پر زور دیا جو کانگرسی نیتاؤں کو سخت ناگوار گزرا لیکن اس پر کلمۃالحق کے اظہار سے کسی پیش بینی کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اس دور میں برصغیر کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جس کے لبوں پر اس کی انقلابی نظموں کے اشعار نہ ہوں، جوش جنگ آزادی کے جیالے نوجوانوں کا ہیرو بن چکا تھا اور اس کی شہرت اور عوامی ہردل عزیزی کے طلسم کو توڑنے کے لئے حریفوں کو بڑے پینترے بدلنے پڑے۔

یہ جوش کی شہرت و قبولیت کے عروج کا دور تھا وہ اس طرح ادبی فضا پر چھایا ہوا تھا کہ اس کے سامنے کسی کا چراغ جلنا محال تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے تمام بڑے چھوٹے شاعر کم و بیش جوش سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ خصوصاً اس دور کی نئی نسل کو تو اس کی شاعری بہت مرعوب کرتی تھی، اس لئے کوئی نوجوان شاعر بھی اس کے جذباتی انداز اور تیز و تند لہجے سے دامن نہ بچا سکا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض نے اس بات کو تیغ الہ آبادی (مصطفٰے زیدی) کی طرح برملا تسلیم کیا اور بیشتر نے مجاز، ساحر، احسان دانش، سردار جعفری وغیرہ نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی۔

مجھے بھی ایک عرصے تک جوش کے بلند آہنگ نے اپنی گرفت میں لئے رکھا، نوجوانی کے دن تھے اس پر افتاد طبع ایسی، جیسے رگ و پے میں بارود بھرا ہو، جوش کو پڑھ کر مجھ پر دیوانگی طاری ہو جاتی، اس طرح میں بھی اسی روش پر چل نکلا اور آزادی، بغاوت، جنگ آزادی کا سپاہی قسم کی تند و تیز نظمیں لکھنے لگا لیکن بعد میں یہ تمام کلام ضائع کر دیا کہ اس میں سوائے نعرہ بازی کے اور کچھ نہ تھا۔ تاہم میں نے جوش کے مطالعہ سے بہت کچھ سیکھا، خصوصاً اس کے ذخیرۂ الفاظ سے میں نے بڑا استفادہ کیا کہ انیس و دبیر کے سوا اور کسی شاعر کے ہاں مترادفات کا اتنا سرمایہ نہیں ملتا اور یہ ایسی دولت تھی جس کے لئے میں اس عظیم شاعر کا ہمیشہ ممنون احسان رہوں گا۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی زندگی اور فن کا تجزیہ کیا جائے تو فارسی کا یہ مصرع پوری طرح اس پر صادق آتا ہے ؎

قلب او مومن دماغش کا فراست

یہ اس اعتبار سے کہ جس جاگیردارانہ ماحول میں اس نے آنکھ کھولی اس کی روایات سے بغاوت کرنے میں قلمی طور پر تو اس نے جہاد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن ذہنی طور پر وہ اس سے اپنا پنڈا نہیں چھڑا سکا۔ یعنی اپنے آپ کو ڈی کلاس کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا، خود

عادات، رہن سہن، وضع قطع، گفتگو آج تک اسی رنگ میں رنگی نظر آتی ہے، وہی رئیسانہ چونچلے، وہی امیرانہ ٹھاٹھ، وہی بورژوا لہجہ، وہی بگڑے نوابوں کے لچھن ـــــ گویا "رسی جل گئی بل نہیں گئے"۔

ان دنوں جوش کے متعلق عجیب و غریب باتیں سننے میں آتی تھیں۔

وہ ایسا بلانوش ہے کہ صبح آنکھ کھلتے ہی پینا شروع کر دیتا ہے اور رات گئے تک پیتا ہی چلا جاتا ہے۔

ظالم نیٹ پیتا ہے اور تین چار بوتلیں روز چڑھاتا جاتا ہے۔

آج تک اسے کسی نے ہوش میں نہیں دیکھا۔

شراب پیتے ہوئے اس پر شعروں کا نزول ہوتا ہے تو رکنے میں نہیں آتا۔

وہ اتنا مغرور ہے کہ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔

اس کے سامنے کوئی غلط لفظ بولے تو کھانے کو دوڑتا ہے۔

درحقیقت یہ سب افسانہ طرازی تھی اس کی اعتدال پسندی کا شہرہ تو مجاز کے اس مشہور لطیفے سے ہوا جو کچھ یوں ہے۔

" مجاز جوش کے ساتھ بیٹھا پی رہا تھا۔ اسے جام پہ جام چڑھاتے دیکھ کر جوش نے کہا ـــــ " برخوردار ـــــ شراب کا لطف لینا ہے اور اس کے ضرر سے بچنا ہے تو میری طرح گھڑی سامنے رکھ کر پیا کرو ـــــ " مجاز نشے کی ترنگ میں بولا ـــــ " آپ گھڑی کہتے ہیں میرا بس چلے تو گھڑا سامنے رکھ کر پیوں۔"

پھر مشاعروں میں جوش سے ملاقاتیں ہونے لگیں تو بڑا مہربان، بڑا شفیق پایا۔ ایک دفعہ اسلام آباد ٹی وی سٹیشن پر شوٹنگ لیٹ ہونے کے سبب جوش سے طویل ملاقات میسر آئی اس بڑھاپے میں بھی اس کا دم خم وہی تھا۔

میں نے پوچھا۔ آپ کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آپ الفاظ کے زور پر شاعری کرتے ہیں اور پُرگوئی کے باعث آپ کی نظموں میں بھرتی کے اشعار زیادہ ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ اب تو ایک عرصے سے آپ اپنے آپ کو دہرانے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"بھائی شعر و ادب کا تو سارا کاروبار ہی الفاظ کے زور پر چل رہا ہے، الفاظ نکال دیئے جائیں تو شاعری میں اور رہ کیا جاتا ہے اور اپنے آپ کو دہرانے

والی بات بھی نری احمقانہ ہے، اس طرح دیکھا جائے تو میر تقی میر، غالب، انیس و دبیر اور اقبال تک سب پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے بلکہ اقبال کی شاعری میں تو جتنی REPETITION ہے وہ شاید ہی کسی اور شاعر میں ملتی ہو، اس لئے کہ اس کا کینوس محدود ہے، وہی خودی کا درد، شاہین کی تکرار، اسلام اور مسلمان کا ذکر، برخلاف اس کے میرے ہاں سیاسی نظموں اور مذہبی کلام کے علاوہ فلسفہ، منطق، حکمت، حسن و عشق سب کچھ ملتا ہے میری شاعری کا کینوس ہے پوری دنیائے انسانیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔"

میں نے کہا ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ آپ کی شاعری میں نعرہ زیادہ ہے اور لہجے میں گھن گرج اتنی ہے کہ آپ کی اپنی آواز اس میں کھو جاتی ہے۔

بولے "ٹھیک ہے میرے سیاسی کلام میں اس مناسبت سے جوش، ولولہ اور جلال ملتا ہے لیکن میری شاعری میں جلالی اور جمالی دونوں کیفیتیں ایک دوسرے سے معانقہ کرتی نظر آتی ہیں، میری غزل، رباعی اور غیر سیاسی نظموں کا لہجہ بالکل مختلف ہے، دھیما اور شگفتہ اور طنزیہ۔"

میں نے کہا۔ اپنی سرگزشت "یادوں کی برات" میں آپ نے بڑی حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اردو میں اپنے متعلق اس قدر صاف گوئی اور برہنہ سچائی کے اظہار کی بلاشبہ یہ پہلی مثال ہے اسی لئے آپ کی شرمیلی قوم بڑی مشتعل ہوئی ہے اور انھوں نے اعتراضات کا طومار باندھا ہے جن میں نہایت بودے اور جاہلانہ اعتراض بھی ہیں۔ ان سے قطع نظر یہ بتائیے کہ معترضین کے مطابق آپ نے ہیرو بننے کی کوشش کی ہے اور اکثر و بیشتر بے جا مبالغے سے کام لیا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے۔ مجھے پوچھنا یہ ہے کہ اگر اتنا مبالغہ نہیں جو کہا جاتا ہے تو کتنا ہے تاکہ اسے منہا کر کے پڑھا جائے۔

"جہاں تک مبالغے کا تعلق ہے تو یہ شعراء کی فطرت ثانیہ ہے ممکن ہے مجھ سے بھی زیب داستان کے لئے، یا مضمون باندھنے کے لئے یا بھولے چوکے کچھ نہ کچھ مبالغہ ہو گیا ہو، ورنہ سچ پوچھئے تو میں نے بہت سی باتوں کو بڑے انکسار اور اختصار سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ میرے ماحول کے لئے گوارا ہو سکیں، ورنہ اگر میں وہ سب کچھ جیسا کہ میں چاہتا ہوں بر ملا لکھ دیتا تو شاید ان تنگ نظر اور تھڑدلے لوگوں کے ہاتھوں میرا جینا دوبھر ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تین بار کے بار دیگرے مجھے مسودے لکھ کر تلف کرنے پڑے اور آخر چوتھی بار اسے

بڑے محتاط انداز میں پیش کیا ہے۔

اچھا اب ایک سوال میں خود پوچھنا چاہوں گا۔ آپ نے اپنی سرگزشت میں اپنے اٹھارہ رومانوں کا اقرار کیا ہے، بعض بقراطوں نے انھیں بھی مبالغہ جانا ہے لیکن ان کے برعکس میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ ایسے دل پھینک اور رنگین مزاج شخص نے تو سینکڑوں معاشقے بھگتے ہوں گے۔ کیا اس معاملے میں آپ نے عمداً کسرنفسی سے کام نہیں لیا اور ایسا کیا ہے تو کیوں؟

"تم ٹھیک سمجھے ہو، درحقیقت میرے معاشقوں کا تو کوئی شمار نہیں یہ تو چند ایک یادگار معاشقوں کا ذکر کر دیا کہ اگر میں سب معاشقوں کا ذکر لے بیٹھتا تو شاید اتنی ضخامت تو صرف انھیں کی ہو جاتی۔"

ملاقاتیں اس کے بعد بھی ہوتی رہیں لیکن سرسری سی جیسے عموماً مشاعروں میں ہوتی ہیں ایک دفعہ بھٹو مرحوم کے دور حکومت میں کوثر نیازی نے کچھ اہلِ قلم کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل راولپنڈی میں مدعو کیا، مدعوئین میں فیض صاحب اور قاسمی صاحب نہیں آئے، میرے علاوہ ابراہیم جلیس مرحوم، ابن انشاء مرحوم، شوکت صدیقی، جمیل الدین عالی اور چند ایک اور دوست بھی تھے جن کے نام بھول رہا ہوں، اس میٹنگ کی جو غرض و غایت تھی، اس پر تو خیر میں نے پانی پھیر دیا لیکن اس سے پہلے مجھے جوش صاحب سے گفتگو کے لئے خاصا وقت مل گیا۔

بات یہاں سے شروع ہوئی کہ گرمی کے دن تھے پہلے کچھ ٹھنڈا مشروب منگایا گیا جو سب نے پیا لیکن جوش صاحب نے سادہ پانی لیا، پھر چائے آگئی لیکن انھوں نے چائے پینے سے بھی انکار کر دیا۔ میزبان نے انھیں بیئر یا وہسکی کی پیش کش کی لیکن وہ اس سے بھی انکاری تھے۔

میں نے کہا۔ چائے تو لے لیجئے اس میں کیا مضائقہ ہے۔

اس پر کہنے لگے "بھائی میں صبح شیریں چائے کے ساتھ روغنی روٹی کا ناشتہ لیتا ہوں اس کے بعد رات کو کھانا کھاتا ہوں دن بھر مکمل فاقہ ہوتا ہے یہ گذشتہ بیس برس سے میرا معمول ہے گویا صائم النہار ہوں۔

میں نے کہا اس حد تک نظم و ضبط تو شاعرانہ روایات کے خلاف ہے، اور آپ کی زندگی تو آپ کے مطابق بڑی بے نظم و ضبط گزری ہے، کوئی پابندی کبھی گوارا نہیں کی، ہر قدر کے باغی رہے ہیں پھر یہ کیا۔

"جی ہاں ـــــ اسی لئے تو ان شاعرانہ روایات سے بھی روگردانی کی ہے، سرشام ہی

کھانا کھا کر سو جاتا ہوں، تہجد گزار تو نہیں لیکن تین بجے شب اٹھ کر ادبی عبادت یعنی لکھنے کا کام کرتا ہوں، اذان ہوتے ہی ٹہلنے کے لئے چلا جاتا ہوں، واپس آ کر ناشتہ کرتا ہوں، پھر اخبار دیکھتا ہوں دن ڈھلتے ایک دو پیگ بڑے پریم سے تقریباً گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں پیتا ہوں۔ یہ ہے میرا روزمرہ زندگی کا معمول، جس میں شاید ہی کبھی ناگزیر حالات میں کچھ فرق آ جائے ورنہ گردش چرخ دوراں بھی اس معمول کو ذرہ بھر نہیں سرکا سکتی۔

سب کو حیرت تھی کہ جوش صاحب اس اجلاس میں کیوں کر آ گئے جب کہ یہ مدعو بھی نہیں تھے کچھ دن پہلے اسلام آباد کے ایک مشاعرے میں جس کی صدارت کوثر نیازی سابق وزیر اوقاف اور اسلامی امور کر رہے تھے جوش اسے بڑھ چڑھ کر داد دیتے ہوئے پائے گئے۔ حالانکہ شعراء کو ہمیشہ شکایت رہی ہے کہ وہ داد لینا جانتے ہیں داد دینے میں ایسے بخیل واقع ہوئے ہیں کہ اچھے سے اچھے شعر پر کبھی بھولے منہ واہ تک نہیں کہتے۔ یہ بات یاروں نے ان تک پہنچائی بھی لیکن وہ ثقل سماعت کا عذر کر کے ٹال گئے اور داد دی بھی تو کوثر نیازی کو جسے شاعر تو کیا انھوں نے اسے کبھی آدمی بھی نہیں سمجھا۔ ان کی اس حرکت کو حاضرین نے بھی اور ٹی وی پر یہ تماشا دیکھنے والے ان کے مداحوں نے بھی بری طرح محسوس کیا۔

اجلاس کے بعد بھی جوش صاحب بیٹھے رہے، یہ صورت حال بھی ان کی وضع داری کے خلاف تھی کہ وہ بھرے مشاعرے میں اپنا کلام سنا کر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اٹھ کر چل دیتے تھے، اتنے میں قدرت اللہ شہاب آئے تو پتہ چلا کہ نیازی نے ان کا وظیفہ بند کر دیا ہے اور بنگلے سے نکالنے پر بھی تلا ہوا ہے، مشاعرے میں داد کے ڈونگرے بھی اسی غرض سے برسائے گئے اور اس میٹنگ میں بھی بغیر دعوت کے اسی لئے آنا پڑا، دکھ بھی ہوا کہ اس عمر میں اتنی صاحب شخصیت کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ بہر حال شہاب صاحب نے انھیں یقین دلایا کہ اس پر لعنت بھیجیں ہم وزارت تعلیم کی طرف سے یہ مراعات جاری رکھیں گے۔

پچھلے دنوں قتیل بھائی پشاور آیا تو اس نے بتایا کہ وہ جوش سے ملا ہے، گھٹنوں نے معذور کر دیا ہے، چلنے پھرنے کے نہیں رہے، قتیل جانے لگا تو میں بھی جوش کو دیکھنے راولپنڈی چلا گیا۔ وہاں اگلے دن ملنے کے لئے فون پر وقت لیا اور جا کر ملاقات کی۔ تقریباً تین گھنٹے ان کے پاس بیٹھے رہے، فراز بھی، ہماری تلاش میں وہیں آ پہنچا۔

جوش صاحب کو دیکھ کر بڑی پریشانی ہوئی، سماعت نہیں رہی، بہت مشکل سے سنتے ہیں

بینائی کمزور ہوگئی ہے، یادداشت نے جواب دے دیا ہے، گھٹنوں نے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے سے لاچار کر دیا ہے، بیساکھیوں کے سہارے رفع حاجت کے لئے جاتے ہیں لیکن کلا ٹھد دیسے کا ویسا ہے رنگ روغن میں ذرا فرق نہیں آیا۔ مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرح تخت پر سنگھاسن جمائے بیٹھے ہیں ان کی بیٹی، بیٹا اور داماد بھی موجود تھے، وہ تینوں ان کے مقابل بوڑھے لگتے تھے۔ خوش طبعی اسی طرح برقرار تھی، ہمیں دیکھ کر کھل اٹھے، خوب چہکتے رہے۔ میں نے حسبِ عادت کچھ پوچھنا چاہا لیکن ان کی ہمشیرہ نے اس کی اجازت نہ دی شاید اس لئے کہ وہ ٹی وی والے جوش کے انٹرویو کی پہلے ہی کافی سزا بھگت چکے تھے۔ وہ انٹرویو کسی نیاز مند نے اس یقین دہانی پر لیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد نشر ہوگا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ مخالفین کے ہتھے چڑھ گیا جو ان سے اختلاف رکھنے والے انسانوں کا دانہ پانی بند کر کے انہیں بھوکوں مارنا عین اسلام سمجھتے ہیں، اسے پچھلے دنوں نشر کر کے مخالف پریس میں ان پر خوب کیچڑ اچھالا گیا اور حکومت کو اکسایا گیا اس اسلامی ملک میں وہ ایک ملحد کو کیوں پال رہی ہے فوراً اس کا وظیفہ بند کیا جائے اور بنگلہ خالی کرایا جائے اور اسے اور اس کے بچوں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے فٹ پاتھ پر ڈال دیا جائے۔

یہ باتیں اس ترقی یافتہ دور میں عجائبات لگتی ہیں لیکن ہمارے ملک میں آئے دن یہ عجائبات ہوتے رہتے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو کچھ دانشور افسروں کا جنھوں نے ان ادب دشمن عناصر کے ظالمانہ ارادے پورے نہ ہونے دیئے ورنہ اس پیرانہ سالی اور معذوری کے عالم میں نجانے ان پر کیا گزر جاتی، ان کا عذر بجا تھا اس لئے میں بھی خاموش ہو رہا۔

اس اثنا میں وہ خاموش مگر پوری توجہ سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا غالباً وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا کیوں کہ اچانک اس نے ہمیں مخاطب کر کے فارسی کا یہ برمحل شعر پڑھا ـــــ

گفتارِ صدق مایۂ آزار می شود
چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود

اور پھر خاصی دیر اس شعر کو دہراتا رہا۔ فراز کے آنے سے جیسے جوش صاحب کی طبیعت جولانی پر آگئی کچھ اپنے اشعار اور رباعیات بھی سناتے رہے لیکن حافظہ ساتھ نہیں دے رہا تھا مصرع بھول جاتے، پرانا کلام تھا، ہم میں سے کوئی یاد دلاتا تو خوش ہو کر مصرع اٹھاتے ـــــ اس دوران دو دفعہ ہم نے رخصت چاہی لیکن ان کا جی چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا اصرار کر کے روکتے رہے، ان کی بیٹی بڑی خاموش طبع، سنجیدہ اور مہذب خاتون ہیں، داماد دمہ کا پرانا مریض لگتا ہے نحیف۔

ونزار ـــــ بات کرنے میں اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ اس کی حالت پر رحم آتا۔ بیٹا بڑا ہونق سا ہے، جوش کی بالکل ضد ـــــ بار بار اپنے شعر سنانے کی کوشش کرتا، جوش قرائن سے سمجھ جاتا اور پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا، وہ ہمیں گاڑی تک رخصت کرنے آیا اور جاتے جاتے دو ایک پھیکی سی غزلیں درجن بھر بے تکی رباعیاں سنا کر اپنا غبار نکالا۔

جوش نسلاً پشتون ہے، اس فخر کا اظہار اس نے اپنی شاعری میں بھی اور نثر میں بھی کھل کر کیا ہے اس کے لہجے کی گھن گرج بھی سرحد سکول کی دین ہے جس کا شجرہ خوشحال خاں خٹک اور پشتو کے اولین شاعر امیر کروڑ سے جا ملتا ہے۔ اسے اردو میں جدید نظم کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سے پہلے اگر چہ نظلیں کہی گئی ہیں لیکن نظم میں اظہار کا بھرپور انداز اور روایت سے بغاوت کا جرأت مندانہ شعور تو جوش ہی نے دیا ہے حریت پسندی، حقیقت پسندی اور صداقت اظہار کا پرچم بھی اسی نے بلند کیا اور اس طرح اس نے ایک ایسے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی جس نے آگے جا کر ترقی پسند تحریک کو جنم دیا، یہی نہیں بلکہ جدید طرز احساس کا آغاز بھی جوش ہی کی نظموں سے ہوا، پھر اس نے جہالت، توہمات اور عقیدہ پرستی کے خلاف اپنی شاعری میں مسلسل جہاد کیا ہے ویسے اس کا سب سے بڑا وصف انسان دوستی ہے جس کا شعور اردو شاعری میں سب سے پہلے واضح طور پر اگر کسی نے دیا تو وہ جوش ہے۔

جو مشرکِ یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط
جو منکرِ انسان ہے، وہ انسان نہیں

"یادوں کی برات" میں جوش کے خود نوشت حالات زندگی ہیں، اس میں اس نے کسی کو نہیں بخشا یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی نہیں معاف کیا۔ اس کتاب کی اشاعت پر بڑا ہنگامہ ہوا، یہ اردو میں پہلی آٹو بائیوگرافی ہے جس میں اگر سو فی صد نہیں تو کم از کم پچاس فی صد دانشگاف حقیقت پسندی اور سچائی سے کام لیا گیا ہے اور بقول اس کے ہماری شرمیلی قوم جو ہر بات کو چھپانے کی عادی ہے اس کا ان برہنہ حقائق سے بوکھلانا برحق تھا۔ اس وضاحت سے جوش کی وکالت مقصود نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اس کی مخالفت جذباتی انداز سے متعصب اور تنگ نظر حلقوں کی طرف سے ہوتی رہی ہے تاہم جوش سے متعلق اس بات میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ نرگسیت کا شکار ہے، ہنگامہ پسند واقع ہوا ہے اور اس کے لئے خود ہی اکثر و بیشتر ایسے اسباب پیدا کرتا رہا ہے۔

ویسے تو ہر شریف شوہر اپنی بیوی سے ڈرتا ہے لیکن جوش کی تو جیسے بیگم کے عتاب سے

ہان جاتی ہے ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کا شوہر ایک پولیس افسر ہے جو اسے جا و بے جا پیٹتا بھی ہے
دراس کے فن کا مذاق بھی اڑاتا ہے۔ ایک موقع پر جوش نے ملکۂ موسیقی سے ازراہِ مذاق کہا۔

"کیا یہ دشمنوں کی اڑائی ہوئی ہوائی ٹھیک ہے کہ تمہارا وہ کمبخت تمہیں بری طرح پیٹتا ہے"

"جی ہاں ـــــ آپ کی بیگم کی طرح وہ میرا عزرائیل ہے۔" اس نے شرارت سے مسکراتے
وئے جواب دیا۔

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں اپنے جیون ساتھی آپس میں بدل لیں۔" جوش نے برابر
ا چوٹ کی۔

"جیون ساتھی بدلنے سے قسمت تو نہیں بدل سکتی جوش صاحب! نہ ہی فطرت بدل سکتی
ہے، کیا معلوم کبھی پٹنے کی خواہش جاگ اٹھے تو پھر ہمیں ان ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے۔" ملکۂ
سیقی نے قہقہہ لگاتے ہوئے یہ فقرہ کس کر جوش صاحب کو لاجواب کر دیا۔

ایک دفعہ جوش صاحب اپنے گھر میں دوستوں سے کہہ رہے تھے۔ "جانے کون گنا ہوں
ا سزا مجھے اپنی بیگم کی صورت میں ملی ہے۔" اتنے میں اچانک بیگم آ نازل ہوئیں، اسے دیکھتے
ا جوش کا رنگ فق ہو گیا، فوراً بات کا رُخ بدل کر مسکراتے ہوئے بولے، بس جی ہم تو اپنی بیگم
دم قدم سے جی رہے ہیں، ہمارا تو ادب، شاعری سب کچھ اسی کے کرم سے ہے۔"

وہ اپنی کتاب "یادوں کی برات" میں لکھتا ہے، میں نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن
م سے کبھی سچ نہیں بول سکا۔

ایک بے تکلف دوست جو مدتوں بعد ملا۔ جوش کے سر پر نظر پڑتے ہی بولا: "ارے
ماری تو چندیا نکل آئی یہ کہیں بھابی کے جوتوں کا کرشمہ تو نہیں۔" جوش نے مسکرا کر کہا ـــ "اے
تے لگانے کی کیا ضرورت ہے، میں خود ہر روز اپنے سر پر سات جوتے گن کر لگاتا ہوں
اس کے پلے کیوں بندھا تھا۔" جوش کی بیگم بیچاری بھی گئی، جوش کے متعلق بھی یہ بری خبر آئی
ہے کہ اسے کینسر ہو گیا ہے۔

ادب و شعر، تہذیب و ثقافت، رندی و سرمستی، انا پرستی، وضعداری، دردمندی، بیباکی
ر سرکشی کا یہ باب بھی ختم ہونے والا ہے۔

مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیدان رفتم

□

ڈاکٹر سیّد محمد عقیل
شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی

جوش کی انقلابی شاعری کا ایک معمولی مطالعہ

اس مقالے میں جوشؔ کے سیاسی افکار اور انقلابی ذہن کا مطالعہ مقصود ہے۔ عام طور پر جوش شباب و شعر اور نغمہ و نور کے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی جنگِ آزادی کے دوران، انھوں نے ہر موقع پر، کچھ ایسے اشعار اور نظمیں پیش کی ہیں کہ انھیں 'شاعرِ انقلاب' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ یہاں نہ جوش کی وطن پرستی اور ہندوستان دوستی، ثابت کرنا مقصود ہے اور نہ ان کی شاعری کا مکمل احاطہ، اس مختصر اور معمولی سے مقالے میں کیا جا سکتا ہے، ہاں اس بات کی کوشش ضرور کی جاتی ہے کہ جوشؔ کے انقلابی مزاج اور انقلابی نظموں نے کس حد تک ملک اور وقت کی آواز پر لبیک کہا ہے۔ اور اس میں انھیں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ ان کے باغیانہ خیالات کے محور اور مدارج کیا ہیں۔ اپنے ذہنی انقلاب سے، جوشؔ کس طرح ملک کی انقلابی صورت حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور پھر کس طرح، ان کی انقلابی شاعری کو ان حالات سے غذا ملتی رہی ہے۔ کس طرح جوش، ملک میں آنے والے انقلاب کی طرف درجہ بدرجہ بڑھتے رہے ہیں۔ وہ آواز جو ؎

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب   میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اور ؎

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں   قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

سے اٹھی تھی، "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" اور "تلاشی" تک پہنچتے پہنچتے، کن کن پیچ و خم سے گزری اور آزادی کے بعد، آج اس آواز کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔

جوش نے باقاعدہ نظم نگاری کا سلسلہ، تقریباً ۱۹۱۴ء میں شروع کیا جب انھوں نے عزیزؔ لکھنوی کی شاگردی اور غزل گوئی ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ انھوں نے بقول خود، سلیم پانی پتی کی ترغیب پر کیا تھا۔ سب سے پہلی نظم جو، جوشؔ نے لکھی وہ 'ہلال محرم'، تھی

یوں کہ نظم نگاری کا فیصلہ محرم کے ایام ہی میں کیا گیا تھا[۱] ہو سکتا ہے کہ یہ فیصلہ انھوں نے اسی وقت یا ہو جسے مولانا عبدالماجد دریا بادی نے۔ "لکھنؤ کی بری صحبتوں میں پڑ کر، شبیر احمد خاں، سے شبیر سن خاں، ہو گئے"[۲] سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے کچھ پہلے بقول جوش :

"ایک کافی مدت تک میں نماز کا بھی نہایت سختی سے پابند ہو گیا تھا۔ نماز کے وقت خوشبوئیں جلایا کرتا اور کمرہ بند کر لیتا... لیکن ان تمام باتوں کے باوجود، دہشت اور اضطراب کے ساتھ کبھی کبھی یہ بھی محسوس ہوتا تھا، جیسے میرے دماغ کے اندر، کوئی خطرناک کمانی کھل رہی ہے... کچھ مدت بعد مجھ میں ایک قسم کا ہلکا باغیانہ میلان پیدا ہو گیا.... اور اب میں اس منزل میں آگیا جہاں ہر قدیم اعتقاد، ہر پارینہ روایت پر اعتراض کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

ن کے ذہن کی یہ ہیجانی صورت تقریباً ۱۹۲۰ء تک ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک فیصلہ لیتے ہیں۔ ہر ایسی چیز سے بغاوت کا۔ روایتی قدریں، دفتر پارینہ، ادیان، صرف اوہام اور سماجی زندگی، محض رسموں کی پابندی، ان کو معلوم ہونے لگی جو بدلتے ہوئے ہندوستان کے نئے ذہنوں کو آسودہ نہیں کتی۔ انگریزی حکومت کا دباؤ، ان صورتوں کو برقرار رکھنا چاہتا تھا تاکہ ملک میں جو وطنیت کی لہر اٹھ ہی تھی، اسے مزید طاقت نہ مل سکے۔ ہر موڑ پہ قدامت کی پاسداری اور جدت سے بھڑکنا، زوال پر معاشرے کا خاصہ ہوا کرتا ہے اور ہوشیار لوگ، اس کا خاص فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیوں کہ جدت با اصول ہوتی ہے اور حالات کے تقاضوں سے وجود میں آتی ہے، تو وہ یقیناً ذہنوں کو متاثر کرتی اور اس کو معاشرے سے طاقت ملتی ہے لیکن اگر یہ محض ایک نقالی اور اوپر سے اوڑھی ہوئی ہوتی تو، اس کا قیام کسی بھی سوسائٹی میں دیرپا نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں جو انگریزوں کے خلاف لی لہریں بلند ہونا شروع ہوئیں تھیں، ان کی جڑیں گہری تھیں اور یہ ایک ایسے ناآسودہ سماج ٹھی تھیں جو ۱۸۵۷ء سے 'آہِ سرد سے نگاہِ کرم' کی طرف گامزن تھا۔ اردو میں نظم نگاری کی ابتدا سے شعری اور فکری نظام میں تبدیلی آتی رہی تھی۔ جس کے خاص محور، غزل سے نظم کی طرف مراجعت ظموں میں سماجی اصلاح سے وطنیت کے جذبے کی طرف توجہ، تعلیمی نظام میں 'کریما' اور 'ماقیماں' آثار اور اسماعیل کی بچوں کے لئے ریڈروں تک۔ پھر حالی کی حبِ وطن بہ نظر باز دید دیکھ لیتا ہے۔ جس سے ہندوستان کے بدلتے ہوئے سماج میں وقت کی رفتار اور ذہن میں آتی ہوئی دیوں کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام، بھی اس مرتے ہوئے نظام

[۱] نگار کراچی، جوش نمبر مطبوعہ نومبر ۱۹۶۰ء۔ [۲] جوش نمبر صفحہ ۱۲۳۔

میں ایک نئے قدم کی آمد کا اعلان ہے جو حکومت کے ساتھ، ایک متوازی تنظیم بنا کر، ابنائے وطن کی بہتری کی فکر کر سکتا ہے۔ جو بھی باشعور اور مستقبل پر نظر رکھنے والا صاحب فکر، ایسے دور میں پیدا ہوگا ممکن نہیں کہ وہ ان تبدیلیوں سے آنکھیں چرا سکے پھر جب کہ اس نے شعر و شاعری کے ایسے راستے کو چنا ہو جس میں چکبست کی ہوم رول تحریکات پر نظموں کے ساتھ ساتھ، اقبال کے ترانۂ ہندی، کی گونج، ہندوستان کے گوشے گوشے میں سنائی دے رہی ہو، اس پس منظر میں جوشؔ نے اگر انقلابی اقدامات کئے تو یہ اقدام عین فضا، ماحول اور شعری روایت کے مطابق تھا۔ ۱۹۱۸ء میں جوشؔ کی لکھی ہوئی نظم 'وطن' اور اس پر لگے ہوئے نوٹ کو نظر میں رکھنا چاہئے۔

> "میں تمام نوع انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں۔ وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور دین آدم کی تقسیم چاہتا ہے، انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ لیکن اس قدر وطنیت پر میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے۔

یہ خیال محض رومانی بغاوت کے سبب وجود میں نہیں آیا تھا کہ اس وقت اس طرح کا اعلان کر کے حکومت سے ٹکر لینے کی بات تھی۔ آج کی سیاست پر تنقید کرتے رہنا جیسا کام نہیں تھا۔ جنھوں نے انگریزی حکومت کا کرّ و فر اور طنطنہ دیکھا ہے۔ وہی جوشؔ کے اس نوٹ کے عواقب کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ 'وطن' سے لے کر 'ذاکر سے خطاب' پھر 'شکستِ زنداں کا خواب' پھر 'شریکِ زندگی سے خطاب' 'غلاموں سے خطاب'، 'حیف اے ہندوستان'، 'مردِ انقلاب کی آواز'، 'دردِ مشترک'، 'زندہ مردہ' 'مقتل کا تیور'، 'وفادارانِ ازلی کا پیام شہنشاہِ ہندوستان کے نام'، 'وقت کی آواز'، 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے' اور 'تلاشی' تک جوشؔ کے فکری اور ذہنی انقلاب کا درجہ بدرجہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں 'ذاکر سے خطاب'، 'حسین اور انقلاب'، 'اے مرتضیٰ'، 'اے موجد و مفکر' اور 'مولوی' کی شمولیت، ایک دوسرے موڑ کا پتہ دیتی ہے جس میں مذہب کی روایت پرستی، ظاہر بینی اور کھوکھلے اوہام کے ساتھ ان واعظین اور مولویوں کے بطون کو بھی ظاہر کیا گیا ہے جو گندم نمائی کے پردے میں جو فروشی کا کام کر رہے تھے۔ جوشؔ کے ذہنی اور فکری انقلاب کو زینہ بہ زینہ، انھیں نظموں سے دیکھنا چاہئے، جنھیں چھوڑ کر جوشؔ کی انقلابی شاعری کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں کچھ مقامات پر تضاد بھی ملتے ہیں، کچھ میں لمحاتی منافرت اور اکثر میں ان کی بغاوت اور انقلابی مزاج کی صحیح صورتیں کارفرما ہیں۔ لیکن انھیں صرف انقلاب کا رومانوی تصور کہنا، جوشؔ کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

جوشؔ کے پاس انقلاب کا کیا تصور تھا؟ یہ پوچھنے سے پہلے، جوشؔ کے ہم عصروں اور ان سے پہلے کے وطن پرست شعرا سے بھی ایسا ہی سوال کرنا چاہیئے۔ جو لوگ جوشؔ سے ایسا سوال کرتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جوشؔ، ایک شاعر اور فن کار تھے، وہ کوئی سیاسی مفکر اور رہنما نہ تھے کہ انقلاب کا کوئی ایسا باضابطہ نظام پیش کر سکتے، جیسا کہ دنیا کے انقلابیوں یا انقلابی مفکرین مثلاً مارکس، اینگلز، ٹراٹسکی، لینن اور ہندوستان میں ایم۔ این۔ رائے یا گاندھی جی نے پیش کیا۔ انھیں چینی انقلابیوں سن یات سین یا ہوچی منہ کے تصوراتی پیمانے سے بھی ناپنا مناسب نہیں ایک شاعر کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے انقلابی شعرا ہی سے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے یہاں جوشؔ کا کوئی دفاع پیش نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی انقلابی شاعری کی حیثیت کو صحیح پس منظر میں جانچنے کی ایک کوشش ہے کہ ہر ادیب اور شاعر کا تجزیہ، اس کے پس منظر اور گرد و پیش کے ماحول ہی سے کرنا چاہیئے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں، جہاں گوپال کرشن گوکھلے، تلک، مسز اینی بسنت اور گاندھی جی، ملک کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت، سیاست کا رخ بدلتے تھے۔ وہاں کسی منظم انقلاب کا اگر کوئی تصور کسی کے پاس تھا تو صرف اس قدر کہ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔ اس کا طریقِ کار کیا ہوگا، یہ بہت کچھ اس وقت کے حالات پر منحصر ہوتا تھا۔ چنانچہ چکبستؔ نے جو مشہور نظم 'ہوم رول' پر لکھی تھی، اس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

برطانیہ کا سایہ، سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا، اور ہوم رول ہوگا

پھر اس کے بعد یہ بھی کہ ؎

یہ اپنے حال پہ جو بیکسی برستی ہے — یہ نائبانِ حکومت کی خود پرستی ہے
یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے — وہاں سنا ہے محبت کی جنس سستی ہے
جو اُن پہ حالِ وطن آشکار ہو جائے — یہ دیکھتے رہیں، بیڑہ یہ پار ہو جائے

یعنی انگریزی حکومت کا جو عملہ، ہندوستان میں ہے، دراصل وہ ہم کرتا ہے۔ برطانیہ کے انگریز اور برطانیہ کا بادشاہ، ایسا نہیں چاہتا۔ اس تصور میں، جو انگریزوں کی خوشامد اور ہندوستانی سیاست کی مفاہمت پرستی اور سیاسی انقلاب کے لئے "جی حضوری" کی جوئے شامل ہے، وہ چکبستؔ کی اپنی آواز نہیں ہے بلکہ بورژوا سیاست کی آواز ہے جس کی قیادت وہ تمام لوگ کر رہے تھے جن کے نام اوپر پیش کئے گئے۔ صرف تلک، ان میں مستثنیٰ ہیں۔ اِسی سیاست سے مفاہمت کے لئے 'ساحلِ ہند سے

جو کراہ وطن، جرمنی تک لڑنے مرنے کے لئے گئے تھے لیکن جب دار سائی کے صلح نامے کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں کے مسائل میں کوئی دلچسپی نہ لی اور جو وعدے انھوں نے کئے تھے، انھیں پورے نہیں کئے تو ہندوستان کی بورژوا سیاست کے پول کھل گئے۔ اسے دھکا بھی لگا۔ انگریزوں کی خوشامد کر کے، ان سے صوبائی حکومتوں کا حاصل کر لینے کا ہندستانی سیاست کا خیال خام بالکل بودا اور بیجان ثابت ہوا۔ ایسی صورت میں جوش سے کسی منظم انقلاب کی تاسیس یا اصول سازی کی توقع کرنا، بہت بڑی زیادتی ہے۔ سیاست کے ایسے دھندلے دور میں، 'وطن' نظم میں جوش کے یہ اشعار، ایک داغ، بے ریا اور کسی حد تک جذباتی وطنیت کی طرف ضرور متوجہ کرتے ہیں۔ اور اگر 'شکستِ زنداں کا خواب'، ۱۹۳۱ء میں لکھی گئی ہے جیسا کہ 'شعلہ و شبنم' کے پہلے ایڈیشن پر یہ تاریخ مندرج ہے تو جوش کی سیاسی سوجھ بوجھ اور ہمت کی داد دینی پڑے گی۔ 'وطن' میں جوش کے کچھ اشعار یوں ہیں ؎

اے وطن، پاک وطن، روحِ روانِ احرار　　　اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن، رنگِ بہار

ہم زمین کو ترے ناپاک نہ ہونے دیں گے　　　تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دیں گے

جی میں ٹھانی ہے یہی جی سے گزر جائیں گے　　　کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے

اِس پوری نظم میں، صاف طور پر چکبست اور اقبال کی ملی جلی گونج سنائی دیتی ہے۔ مگر مفاہمت یا دلداری کی کہیں کوشش نہیں کی گئی۔ اور پھر 'شکستِ زنداں کا خواب'، میں تو ایسے اشعار ہیں جو انگریزی حکومت کے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج ہیں ؎

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہے
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

تقریباً اسی کے گرد و پیش وہ چھوٹی سی نظم بھی ملتی ہے جو 'لمحۂ آزادی'، کے نام سے 'شعلہ و شبنم' میں درج ہے۔

سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی، ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

ایسی باتیں ۱۹۴۰ء کے بعد کہنا تو آسان تھا مگر ۱۹۲۰ء-۲۱ء یا ۱۹۳۰ء تک بھی، اس طرح کی باتیں، حکومت کو مخاطب کر کے یا عوام سے کہنا بہت مشکل بات تھی۔ ان سنین کے درمیان شمالی ہندوستان کے مشہور اخباروں کی فائلوں میں بہت سے بیانات، سیاسی حکمرین اور قائدین کے بھی ہیں مگر کسی میں، اتنا واضح بیان شاید ہی ملے۔ یہ بات ابھی شاید لوگوں کو یاد ہو کہ ۱۹۲۱ء میں حسرت موہانی نے جب احمد آباد کے کانگریس کے اجلاس میں، آزادی کامل، کا رزولیوشن سبجکٹ کمیٹی کے اجلاس میں پیش کر دیا تھا تو گاندھی جی، گھبرا گئے تھے اور اس طرح کے رزولیوشن کو قبل از وقت قرار دے کر انھوں نے رزولیوشن واپس کر دیا۔ کوئی بھی مصلحت پسند، ایسے نازک موقع پر، اس طرح کی باتیں نہیں لکھ سکتا جس طرح باتیں 'شکستِ زنداں کا خواب' یا 'حیف اے ہندوستاں' میں لکھی گئی ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے قریب کی ایک نظم 'خریدار تو بن' کا پہلا ہی شعر آزادیٔ کامل، کے تصور سے شروع ہوتا ہے جس میں حسرت موہانی اور ملک کے عوام کے تقاضوں کی گونج سنائی دیتی ہے ؎

اے دل، آزادیٔ کامل کا سزاوار تو بن
پہلے اس کاکُلِ پیچاں کا گرفتار تو بن

اور پھر اسی نظم کے مقابل کی دوسری نظم "خریدار نہ بن" کا آخری شعر یوں ہے ؎

پست سے پست ہو جو چیز، وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن

یہ اشعار، ہندوستانیوں کی رگ حمیت پر ایک ضرب ہیں۔

گاندھی جی ایک عملی سیاست داں تھے۔ وہ ملک کی رفتار اور انگریزوں کی طاقت کا اندازہ خوب اچھی طرح کر چکے تھے۔ ہندوستان کے عوام الناس کا مزاج بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس وقت انگریزوں کو ناراض کر کے، کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہندوستان ابھی اس قابل ہے کہ اتنی بڑی طاقت سے ٹکر لے سکے۔ اگر ٹکر کی نوبت آئی تو سوا کشت و خون کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مفت میں جانیں جائیں گی۔ جوش کے انقلابی خیالات کی عملی صورت بھی سوا کشت و خون کے اور کیا ہو سکتی تھی۔ ذہن تو پیدا کیا جا سکتا ہے مگر صرف ذہن کی بیداری کسی انقلاب لانے کے لئے برگ و ساماں کا کام نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے جو کسی انقلاب لانے والی جنگ یا شورش کا ساز و سامان بن سکتے ہیں۔ سید احتشام حسین نے جوش کے لئے ایک جگہ بڑی دلچسپ بات لکھی ہے کہ:

"جوش، اس پُرخلوص سپاہی کی طرح گولیاں چلاتے رہے جو جنگ فتح کرنے کی دھن میں اتنا دیوانہ ہو چکا ہے کہ نہ اپنے ساتھیوں پر نگاہ رکھتا ہے، نہ میدانِ جنگ کی شاطرانہ چالوں سے کام لیتا ہے اور جنگ کے دوسرے محاذوں کی حالت سے بھی واقف نہیں۔"

جوش کے خیالات، ذہن کو اکساتے رہے، ہندوستانیوں کو بغاوت کی دعوت دیتے رہے، مگر یہ بغاوت، بے ساز و برگ بغاوت تھی۔ اصل انقلاب لانے والا طبقہ، ہندوستان میں، اس وقت تک صحیح طور پر بیدار نہیں ہوا تھا اور سچ بات یہ ہے کہ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں انقلاب کا صرف ایک ہی بازو، یعنی کسان موجود تھا۔ مزدور طبقے کا آنا عملی اقدام، اس وقت تک نہیں ہو سکا تھا۔ جوش نے ۱۹۳۴ء کے قریب 'کسان' پر جو نظم لکھی ہے، وہ ان کی حالات سے باخبری کی دلیل ہے، صرف رومانوی 'ہاؤ ہو' نہیں، اگرچہ ان کے اسٹائیل سے یہی مترشح ہوتا ہے۔

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے، عزّ و وقار — کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاج دار
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ — جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدّن کا چراغ
دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پر مشقت کے نشاں — کھیت سے پھیرے ہوئے منھ، گھر کی جانب ہے رواں
اپنی دولت کو، جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے — دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے

یہ وہ دور تھا جب ۱۹۳۲-۳۳ء میں کسان آندولن، بڑے زور شور سے شروع ہو چکا تھا۔ کسانوں نے لگان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کی زمینیں بحق سرکار ضبط ہو رہی تھیں۔ ان کے کھیتوں سے انھیں بے دخل کیا جا رہا تھا۔ ہر طرف انتشار کی صورت تھی۔ ادھر ۱۹۳۴ء کے زلزلے نے بہار کے کسانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ کچھ ہی دنوں پہلے کسانوں کے مسائل پر پریم چند کا 'گوشۂ عافیت' اردو میں اور 'چوگان ہستی' شائع ہوا اور اسی مسئلے پر پریم چند کا ایک اور ناول 'گئودان'، تشکیل کی منزل میں تھا۔ کسانوں کا مسئلہ، ہندوستان کے شعرا اور ادیبوں کو خاصا، متوجہ کر رہا تھا۔ کساد بازاری کا دوسری طرف یہ عالم تھا کہ غلّہ، فصل پر تقریباً ایک روپئے میں بیس سیر بکتا تھا۔ ایسی حالت میں کسانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب 'تلاشِ ہند' میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اور اس دور کے مزدوروں اور کسانوں کی پوری تفصیل، رجنی پامی دت کی کتاب 'نیا ہندوستان' میں مزید تفصیل سے دیکھی جا سکتی ہے۔ قحط، مفلسی اور مفلوک الحالی کی صورتیں، قدم قدم پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ کون حساس ادیب، ان حالات کی طرف آنکھیں چرا سکتا تھا۔ ہندی کے ادیبوں میں، میتھلی شرن گپت

نرالا، بال کرشن شرما نوین اور سبھدرا کماری، سب کی شعری تخلیقات، ان حالات سے متاثر ہیں۔ کسان مزدور، ملک میں جنگ آزادی کی کشمکش، ملک کو آزاد کرانے کی فکر، ہر باشعور اور ترقی پذیر ادب کا مزاج بن رہی تھیں۔ چھایا وادی، جو رنگ و نور، شہد و شبنم، چاندنی اور جھرنوں کی باتیں کرتے تھے ان کے یہاں ملک سے محبت کے اظہار کی لہریں ابھر آئی تھیں۔ اِن حالات نے جوشؔ کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انھوں نے آواز دی ؎

تڑپ کے مجھ کو پکارا ہے ملک و ملت نے
اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں
لبِ حیات نے چھیڑا ہے قصۂ خونیں
مری زبان کو اب رخصتِ کلام کہاں

کان پور کے ۱۹۳۱ء کے ہندو مسلم فساد میں تقریباً سات سو افراد ہلاک ہوئے۔ جوشؔ کے تجزیے کے مطابق، انگریزی حکومت ایسے فسادات کرا رہی تھی اور ہندو مسلمان، جو آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے، انھیں جنگ آزادی میں پیچھے ڈھکیلنے کا یہ اچھا حربہ، ان کے ہاتھ آیا تھا۔ "مقتل کا تیور" لکھ کر جوشؔ نے طیش اور طنز کے انداز میں اس نظم مں اپنے دل کی آواز بلند کی ؎

اس طرح انسان اور شدت کرے انسان پر
تف ہے تیرے دین پر، لعنت ترے ایمان پر
رکنے ہی والا ہے، آزادی کا جاں پرور جہاد
اے فرنگی! شادماں باش و غلامی! زندہ باد

غیر کی خدمت گزاری، باہمی خوں ریزیاں
دوپہر کی دھوپ سر پر، اور یہ خوابِ گراں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستاں

گردن کا طوق، پاؤں کی زنجیر کاٹ دے
اتنی غلام قوم میں ہمت کہاں ہے جوشؔ

میتھلی شرن گپت کے 'ساکیت' اور 'جھنکار' میں بھی یہی کیفیت کبھی کبھی ابھرتی ہے۔ اگرچہ یہ جلال کرشن گپت جی کے یہاں نہیں ہے۔

۱۹۲۸ء میں جب سائمن کمیشن آیا اور اس نے ہندوستانیوں سے مفاہمت چاہی تو ملک میں سیاسی سرگرمیاں رکھنے والے، دو گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ مفاہمت کے حق میں تھے، کچھ اس کمیشن کو محض انگریزوں کی ایک چال سمجھ رہے تھے، جو جنگ آزادی کی تیزی کو منتشر کر دے۔ جوشؔ دوسرے گروہ کے ساتھ ہو گئے اور زوال جہانبانی، جیسی نظم لکھی۔ معلوم نہیں کہ جو لوگ، جوشؔ کو موقع پرست اور محض رند لاابالی اور سیاسی انقلابات سے بے خبر، کہتے ہیں، وہ جوشؔ کے ایسے اشعار کا کیا تجزیہ کریں گے؟ ۱۹۲۸ء میں کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ہندوستان کی تقدیر کیا ہوگی؟

اٹھائے گا کہاں تک جو تیاں سرمایہ داروں کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی

ازل سے نوعِ انسانی کے حق میں طوقِ لعنت ہے
کسی ہم جنس کی چوکھٹ پہ عادت، سر جھکانے کی

نہ ہو مغرور، اگر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی
کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے غافل بنانے کی

گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا
ضرورت ہے، قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

کوئی چاہے تو اس نظم پر یہ کہہ سکتا ہے کہ اس میں اقبال کے 'خضرِ راہ' کی بازگشت ہے اور کچھ نہیں۔ مگر سوچنے کا یہ طریقہ، صحیح تنقیدی رویہ نہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ:-

"جوش کی ساری گھن گرج، ایک نادان کے ہاتھ کی تلوار ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ کس سمت رُخ کرے گی اور کس کا گلا کاٹے گی۔ اس طرح کی گھن گرج اور دشنام طرازی میں جرأت اور دلیری ضرور پائی جاتی ہے، لیکن یہ جرأت اپنے اندر کوئی شعور نہیں رکھتی۔ یہ کبھی کبھی ناداں کے ہاتھ میں تلوار بن جاتی ہے جس سے وہ اپنا گلا بھی کاٹ سکتا ہے اور اس کا بھی جس کا وہ دوست ہو۔"

(فکر و فن ص۱۴۶ ۱۴۸)

یہ جوش کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۷ء تک جس طرح درجہ بدرجہ، سیاست کے ہر موڑ پر جوش نے جو کچھ لکھا، اس سے تحریک آزادی کے مفاد کو کیا نقصان پہنچا؟ یا سیاست کی صحیح سمت کو چھوڑ کر انھوں نے کون سا قدم ایسا اٹھایا جس سے تحریک آزادی یا اس وقت کی ترقی پسند سیاست کے لئے ان کی نظمیں نقصان دہ ثابت ہوئی ہوں اور اس طرح نادان کے ہاتھ میں تلوار کا انھوں نے کام کیا ہو؟ پھر جوش، جنگ آزادی اور انقلاب کے نہ تو محقق تھے، نہ ان کے ہاتھ میں، ملک کے سیاست دانوں کی طرح سیاست کی باگ ڈور تھی کہ ان کی غلط پالیسی کی وجہ سے تحریک آزادی کو کوئی دھکا پہنچا ہو۔ ان کی یہ سوجھ بوجھ کتنی ہی لمحاتی اور جذباتی کیوں نہ رہی ہو، مگر ملک کی قومی سیاست سے ہمیشہ قدم ملا کر چلتی رہی ہے۔
سائمن کمیشن کے سلسلے کی دوسری نظم 'دامِ فریب' ہے اور پھر 'زنداں کا گیت' جوش کی اس طرح کی نظم نگاری کا سلسلہ، برابر قومی سیاست کے پیچ و خم کے ساتھ چلتا رہا ہے۔ اور یہ باتیں اور نظمیں محض تفریحاً، صرف محفل آرائی کے لئے نہیں ہو سکتیں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ وہ وقت ہے جب جوش حیدرآباد کی نشاط انگیز محفلوں میں، بہ ظاہر 'دنیا و مافیہا' سے بے خبر ہو سکتے تھے اور عام طور پر یہی سمجھا بھی جاتا تھا۔ ان کا شمالی ہندوستان سے بھی برائے نام واسطہ رہ گیا تھا، جہاں قومی سیاست سب سے زیادہ متحرک اور جاندار سمجھی جاتی تھی۔ پھر جو آدمی، شاہی کے زیرِ سایہ پرورش پا رہا ہو، ایسے

دربار سے وابستہ ہو جہاں، فانی بدایونی اور جلیل مانکپوری جیسے اساتذہ کی صحبتیں تھیں، اسے ایسے سیاسی مسائل سے کیونکر دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے جب تک اس کا ذہن اور ضمیر بیدار نہ ہو۔ ایسے ماحول میں رہ کر، بغیر، اس کیفیت کے، کس طرح جوش، سائمن کمیشن، گول میز کانفرنس اور کسانوں کے اندولن سے واقف ہی نہیں بلکہ متاثر رہ سکے ہوں گے؟۔ یہ سوال ان لوگوں سے خاص طور پر پوچھا جانا چاہئے، جو جوش کو صرف ایک خوش باش رومانی شاعر سمجھتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے آنے پر جوش کی نظم 'دام فریب' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہیں ہے دھوپ سے نادان، بدتر — غلامی کی گھٹا کا شامیانہ
لگی ہے گھات میں مدت سے تیری — فرنگی کی نگاہِ جاودانہ
عدو تیری گرفتاری کی خاطر — مہیا کر رہا ہے آب و دانہ
اگر جینا ہے آزادی سے تجھ کو — سنا دشمن کو پڑھ کر یہ ترانہ

"بِرَو، این دام، بر مرغِ دگر نِہ
کہ عنقا را، بلند است آشیانہ"

پھر اسی حیدرآباد میں ۱۹۳۱ء میں 'زنداں کا گیت' لکھا گیا ؎

یہ رنگ کیا ہے کشورِ ہندوستاں کا آج — ہر ذرۂ حقیر ہے بستاں لئے ہوئے
اس موجِ خوں سے دل میں نہ لانا کبھی ہراس — یہ موجِ خوں ہے، لعلِ بدخشاں لئے ہوئے
ان جالیوں پہ محبسِ تاریک کی نہ جا — یہ جالیاں ہیں، جنبشِ مژگاں لئے ہوئے
ان کروٹوں کو، اہلِ قفس کی، سبک نہ جان — یہ کروٹیں ہیں، موجۂ طوفاں لئے ہوئے
آزادیوں کو دیکھ رہا ہے لطیف خواب — زندانیانِ عشق کو زنداں لئے ہوئے
جوش، اہلِ دل کے پاؤں کی زنجیر پر نہ جا — یہ سلسلہ ہے زلفِ پریشاں لئے ہوئے

پھر ۳۳-۱۹۳۲ء میں ان کی نظم 'ہوشیار' چھپی۔ اس میں بھی اسی طرح کا انتباہ اور آگہی کی باتیں کہی گئی ہیں ؎

ضعف و قوت میں توازن پھر یہ ممکن ہی نہیں — پھول سے گلچیں کا ہر پیمان ہے نا استوار
رحم کی درخواست سے پہلے، یہ دل میں سوچ لے — خون ہے خادم کا، آقا کے گلستاں کی بہار
تن سے رخصت ہو رہی ہے روحِ مزدورِ ضعیف — حلق پر رکھا ہوا ہے خنجرِ سرمایہ دار
دیکھتا ہوں عصرِ حاضر کی نگاہِ مہر میں — وہ دہکتی آگ، کانپیں جس سے دوزخ کے شرار

پھر ۱۹۳۹ء میں جب "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے، والی نظم کے لئے جوشؔ کے گھر کی تلاشی ہوئی۔ تو جوشؔ نے "تلاشی" نام کی نظم لکھی جسے پریس نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ "تلاشی" کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد — آمرے دل کی تلاشی لے کر بر آئے مراد
جس کے اندر دہشتیں پُرہول طوفانوں کی ہیں — لرزہ افگن آندھیاں، تیرہ بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر ناگ ہیں، اے دشمن ہندوستاں — شیر جس میں ہونکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں، افسر دارِ تزنگ کی — جس میں ہے گونجی ہوئی آواز طبلِ جنگ کی

ان تمام اشعار اور نظموں کے بعد، جو کہ درجہ بدرجہ، جوشؔ کے سیاسی عقائد کے مدارج طے کرتی ہیں، ان کے لئے یہ کہنا کہ :

"جوشؔ کی عام طور پر یہ عادت ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں کو اپنی قوت نظم کے بل بوتے پر شعر کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کو یہ بات سمجھا دی کہ یہ موضوع بڑا اہم ہے یا ترقی پسند ہے تو جوشؔ فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ جاتے ہیں چونکہ یہ موضوع ایک تخلیقی عمل سے گزر کر ان کی شخصیت اور ان کے شاعرانہ ادراک سے ہم آہنگ نہیں ہوتا، اس لئے اس کا ایک خلاصہ یا دھندلا سا تصور لے کر قافیہ پیمائی شروع کر دیتے ہیں۔" (فکر و فن ص ۱۵۳)

یہ مناسب بات نہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر شاعر خالص سیاسی انداز کی شاعری کرے تو، پایۂ شاعری سے ساقط ہو جائے۔ اگر صرف حالات کا پرتو پیش کرے تو وہ صرف قافیہ پیمائی کر رہا ہے۔ تو پھر اس کا کیا فرض ہے اور اس سے، اہل علم کے تقاضے کیا ہیں۔؟ اگر کوئی شاعر، کارل مارکس کا فلسفہ نظم کر دے تو اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ شاعری کیا ہوئی؟ اور اگر اس تحریک سے متاثر ہو کر، کچھ لکھے جو ہندوستان گیر تحریک ہے تو اسے محض سنی سنائی باتوں کا ناظم محض کہا جاتا ہے۔ یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ پھر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے اردو شعرا میں وہ کون سا شاعر ہے، جس نے قومی سیاست کو جذب کر کے ایسی شاعری کی ہے جس میں نہ پروپگنڈہ ہے، نہ کف در دہاں چیخ اور نہ محض ہنگامیت جب بھی شاعری، کسی قومی تحریک یا سیاسی مسلک سے وابستہ ہوگی، اس میں خطابت کا آنا لازمی ہے اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک تمام قومی تحریک سے وابستہ شاعری، اس خطابت سے خالی نہیں۔ یہاں تک کہ ہندی اور بنگالی شاعری بھی اس سے خالی نہیں۔ انگریزی ادب میں بھی ساسون اور ٹرینچ یونس

(TRENCH POETS) کی مثالیں موجود ہیں۔ پھر لوئی میکنیس، آڈن، اسپنڈر۔ سی۔ ڈے۔ لیوس اور تمام کنٹری پوئٹس (COUNTRY POETS) کوئی اس سے خالی نہیں ہے۔ سی۔ ڈے۔ لیوس نے اپنی نظم "دی والنٹیر" (THE VOLENTEAR) میں ایک کتبہ، ان لوگوں کے لئے تحریر کیا جنھوں نے انٹرنیشنل بریگیڈ (INTERNATIONAL BRIGADE) میں بھرتی ہو کر جنگ کی تھی اور مارے گئے تھے۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا یوں ہے۔

TELL THEM IN ENGLAND, IF THEY ASK
WHAT BROUGHT US TO THESE WARS
TO THIS PLATEAU BENEATH THE NIGHTS
GRAVE MANIFOLD OF STARS

IF WAS NOT FRAND OR FOOLISHNESS
GLORY, REVENGE OR PAY:
WE CAME BECAUSE OUR OPEN EYES
COULD SEE NO OTHER WAY.

اس نظم کو پنٹو (PINTO) نے اپنی مشہور کتاب 'کرائسس ان انگلش پوئیٹری' میں لکھا ہے کہ اس نظم میں ایسی کلاسکی تابندگی اور روانی ملی جسے خطابت میں بھی کنٹری پوئٹس (COUNTRY POETS) کے کسی شاعر کا کلام نہیں پا سکا۔ اوپر کے اقتباس میں، ملکی اور سیاسی حالات اور جنگ میں شامل ہونے کے عقلی جواز کے ساتھ پروپگنڈہ کو شامل کر کے، شاعر نے نظم والنیٹر کو لافانی بنا دیا۔ آج یہ نظم، سوا ایک تاریخی واقعے اور ملک پر جاں نثاری کی داستان کے اور کیا ہے۔؟ پھر کلاسکیت، اگر کچھ ہے، تو ایک لمحے کی تہذیب اور جاں نثاروں کے ایثار کی داستاں لبی، یہی شعری سانچہ، اشعار کی دار و بست اور شاعر کے جذبے کا بہاؤ، نظم میں قوت (VIRILITY) پیدا کرتے ہیں اور جوش کی تمام نظموں میں یہ قوت، یہ بہاؤ اور کلاسکیت موجود ہے۔ پنٹو کے الفاظ میں۔ ان میں ایک INNER RADIANCE OF FEELING بدرجہ موجود ہے لیکن جوش کا اطناب، کہیں کہیں مصرعوں کو بے کیف بھی بنا دیتا ہے جسے، سی۔ ڈے۔ لیوس نے EMOTIONAL THINNESS سے تعبیر کیا ہے اگر جوش کے پاس تغزل اور شعریت کا فن نہ ہوتا تو ان کا انقلابی اور سیاسی موضوع، وقتی اور لمحاتی ہونے

کے سبب سے بے حد ناپائدار ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ وقتی اور ملکی موضوعات آج بھی، اسی شغف کے ساتھ نظم کئے جاتے ہیں، جس طرح بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں نظم کئے گئے۔ یہاں تک کہ ابھی ہندوستان اور پاکستان .... پاکستان کی لڑائی کے وقت پاکستان کے مشہور جدید غزل گو ناصر کاظمی نے بھی 'سیالکوٹ تو زندہ رہے گا، صدائے کشمیر، ہوا باز ہمارے، 'سرگودھا میرا شہر، پاک فوج کے جواں تو ہے عزم کا نشان' ' ہر محاذ جنگ پر' اے ارض وطن، 'گلشن پاک ہمارا' جیسی نظمیں لکھی ہیں جن میں محض یک رخا پروپگنڈہ ہے۔ اس مجموعے کی حیثیت خود شاعر کی نظر میں کیا رہی ہے اس کے لئے 'نشاطِ خواب' (ان نظموں کے مجموعے کا نام ہے) کے پہلے صفحے پر یہ شعر لکھا ہوا ہے

ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آبدار اس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جاں کنی

۱۹۳۶ء میں جوش نے دلی سے کلیم نام کے رسالے کا اجرا کیا۔ اس رسالے کے ۱۹۳۷ء کے ایک نمبر میں، انھوں نے ایک معرکے کا مضمون لکھا۔ جس کا عنوان تھا " اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت"۔ اس مضمون میں سے دو اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں، جن سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی انقلاب اور انقلابی شاعری، اس وقت جوش کے کتنے محبوب موضوعات تھے۔

" میں حیران ہوں، کیا آپ واقعی نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے۔ دانے دانے کو ترس رہا ہے۔ کیا آپ کے علم میں اب تک یہ نہیں آیا کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں، بھوک سے تنگ آکر اپنے کلیجے کے ٹکڑوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ذبح کر ڈالتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ہر سال آپ کے کتنے گریجویٹ بے روزگاری سے گھبرا کر زہر کھالیتے ہیں۔"

•

" لیکن ہندوستانیو! تمھاری سماعت کو کس طرح طوفانی بجلی کی کڑک اچک لے گئی۔ کیا واقعی تم نہیں سنتے کہ ہندوستان کی ہواؤں میں انقلاب سانس لے رہا ہے۔ سنسنا رہا ہے .... اور کیا تمھیں نہیں معلوم کہ جب رات کا پراسرار سناٹا، پہنائے عالم کا احاطہ کرلیتا ہے تو نامعلوم سمتوں سے 'انقلاب۔ انقلاب' کی دھیمی آوازیں صبح تک آتی رہتی ہیں۔" (افکار، جوش نمبر ص ۱۰۵)

اس مضمون میں جا بجا ہندوستان کی زبوں حالی، افلاس اور کس مپرسی کا جہاں ذکر ہے، وہیں ذہن اور فکر میں بھی انقلاب لانے کی باتیں ہیں۔ ظاہر ہے یہ باتیں وہی کہہ اور کر سکتا ہے جو واقعی اندر سے

تبدیلی کے لئے فکر مند ہو۔ یہ باتیں نہ صرف محفل سازی کے لئے ہیں اور نہ محض "سن کر" فیشن کے طور پر لکھی گئی ہیں اور نہ صرف رسالہ فروخت کرنے کے لئے۔ اس مضمون کا لکھنے اور چھاپنے والا، اس بات سے باخبر ہے کہ ایسی باتوں سے اس وقت رسالے نہیں چل سکتے تھے، جیسا کہ 'کلیم' کا حشر بھی ہوا مشکل یہ ہے کہ انقلاب کے تصور کو اگر کوئی صرف اشتراکیت سے وابستہ کرے گا تو یقیناً، اس وقت، جب یہ نظمیں اور مضامین لکھے گئے ہیں، جوش کے پاس اشتراکیت کا کوئی واضح کیا، دھندلا تصور بھی نہ تھا۔ 'وقت کی آواز' جو ۱۹۴۵ء کے اواخر میں لکھی گئی ہے، اس سے پہلے، جوش نے شاید ہی اشتراکیت کے فلسفے یا اشتراکی انقلاب کی بات کی ہو۔ پھر ان کے پاس اشتراکیت کا کیا شعور تھا، یہ کہیں بھی واضح طور پر، جوش نے 'وقت کی آواز' سے پہلے، دوسری اور تیسری دہائی میں ظاہر نہیں کیا۔ لیکن ان کا سیاسی شعور، جیسا کچھ بھی تھا، وقتی ہنگامہ آرائیوں میں کھویا نہیں۔ آزادی کی لڑائی لڑتے ہوئے، ہندوستانی سیاست میں، بہت سے پیچ و خم آئے۔ جون ۱۹۴۱ء میں، سویت روس پر جرمنی کے حملے نے عالمی جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا اور یہ خیال عام ہونے لگا کہ محوری طاقتیں، متحد ہو کر، تمام دنیا کو آپس میں بانٹ لینا چاہتی ہیں۔ جنگ کا جو نقشہ بن رہا تھا، اس میں دنیا سامراجی اور سوشلسٹ نظام، دونوں سے نکل کر فاسسٹوں کے قبضے میں پہنچنا چاہتی تھی۔ یہ ایک ایسا نظام بن رہا تھا جس میں رہی سہی انسانیت کے پرخچے اُڑتے نظر آ رہے تھے۔ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست، دوسری جنگ عظیم کے قریب بہت کچھ اشتمالی صورتوں اور اشتمالی نظام زندگی کو پسند کرنے لگی تھی۔ جواہر لال نہرو نے جب ۱۹۳۵۔۳۶ء میں روس کا دورہ کیا تھا، وہاں کے حالات سے وہ کافی متاثر ہوئے۔ وہ خاصے سوشلسٹ ہو گئے تھے۔ پھر سامراجی، جو ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے، ان سے اگر کوئی نجات دلا سکتا تھا تو صرف سوشلزم کی طاقت اور فکر ہی ہو سکتی تھی۔ محوری طاقتوں سے ہاتھ ملا کر، انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کا تصور، نہ گاندھی جی کو پسند تھا اور نہ کسی سوجھ بوجھ رکھنے والے اچھے سیاست داں کے حلق سے یہ بات نیچے اترتی تھی۔ اس لئے کہ اس میں خطرہ زیادہ تھا اور فائدہ شاید ہی ہوتا۔ لیکن انگریزوں سے، ہندوستان اس قدر پریشان ہو چکا تھا کہ، کچھ لوگ نجات کا یہ ذریعہ بھی سوچتے تھے کہ جس طرح بھی ہو، انگریزوں سے نجات فی الحال حاصل کر لی جائے، بعد کو دیکھا جائے گا۔ لیکن ایسے لوگ نہ دور میں تھے اور نہ انھیں محوری چالوں کا صحیح اندازہ تھا۔ سیدھا راستہ، سوشلزم ہی کا زیادہ سمجھ میں آتا تھا۔ اس طرح ملک کی اس وقت کی جدید سیاست، تیسری دہائی کے بعد، چوتھی دہائی میں داخل ہوئی تو سوشلزم کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ ہونے لگا۔ ملک کی قومی سیاست کی نظر، روز بروز اشتراکی طاقت پر پڑنے لگی۔

تاہم ہندوستان، ایک اور چپقلش میں گرفتار تھا۔ صورت حال عجیب و غریب تھی۔ اگر ہندوستانی، لڑائی میں اتحادیوں کی مدد نہیں کرتے تو نازی فاسسٹوں کی طاقت انہیں سمیٹ لے گی اور اگر مدد کرتے ہیں تو سامراجیوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں، ہندوستانی، مدد کر کے سامراجیوں سے دھوکا بھی کھا چکے تھے۔ اس طرح عجیب کشمکش کی منزل تھی۔ تلاش ہند میں جواہر لال نہرو نے کسی مصری سیاست داں کا ایک طنزیہ جملہ لکھا ہے۔ مصری سیاست داں نے جواہر لال نہرو کو مخاطب کر کے کسی کانفرنس میں کہا:

"YOU HAVE NOT ONLY LOST, YOUR OWN FREEDOM, BUT YOU HELP THE BRITISH TO ENSLAVE OTHERS."

(آپ لوگوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی آزادی کھوئی ہے بلکہ دوسروں کو بھی غلام بنانے میں برطانیہ کی مدد کر رہے ہیں)

لیکن یہ بات دھیرے دھیرے ضرور واضح ہو رہی تھی کہ ہندوستان، اب انگریزوں کے ہاتھ میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتا۔ ایک واضح تبدیلی آئے گی، جس کا انتظار کرنا چاہئے۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں 'مستقبلِ ہندوستان' کے عنوان سے، جوش نے ایک نظم لکھی، جس میں اس امید کی جھلکیاں نظر آتی ہیں کہ اب حالات بدل رہے ہیں۔ جلد ہی ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ ہونا چاہتا ہے۔ یہ نظم 'سنبل و سلاسل' کے صفحہ ۱۳۲ پر درج ہے جس کے حسب ذیل اشعار قابلِ توجہ ہیں ؎

یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی ہے آسمانوں پر
زمیں کا ذرہ ذرہ پُرفشاں معلوم ہوتا ہے

اٹھایا ہے یہ کس نے جھٹ پٹے کا طرفہ آئینہ
تبسم کارواں در کارواں معلوم ہوتا ہے

بحمداللہ کہ جوش، اس صبحِ نو کی تازہ کاری میں
مجھے مستقبلِ ہندوستاں معلوم ہوتا ہے

اس کے بعد، جوش کے یہاں نئے سیاسی شعور کے ارتقائی مدارج کی بہت واضح جھلک نہیں ملتی۔ 'تین فریادیں'، 'بے چارگی'، 'درسِ آدمیت'، اور 'رشوت' میں ایک ٹھہراؤ ہے۔ حالات سے ناآسودگی کا اعلان تو ہے مگر سیاسی ذہن کی کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ اب حکومت اپنی تھی اور جوش بقول اکبر "مدخولۂ گورنمنٹ" ہو چکے تھے۔ وہ 'آج کل' اور 'ابلاغِ عامہ' کے ایڈیٹر تھے جو سرکاری ادارہ تھا۔

جوش کے یہاں منضبط (WELL KNIT) فلسفۂ فکر کی تلاش بیکار ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر اچھے شاعر کے یہاں کوئی باقاعدہ فلسفۂ فکر لازمی طور پر مل جائے۔ لیکن اگر کسی سلسلۂ خیال

کو ربط دے کر کوئی فلسفۂ فکر بنانا ہی چاہے، تو جوش کے یہاں، انسانی محبت، بھائی چارہ اور آدمیوں کے ساتھ خلوصِ مجسم، ایک سلسلۂ خیال بن سکتا ہے۔ جوش عملی سیاست کے آدمی نہ تھے لیکن اپنی انقلابی جدوجہد سے اوہام اور جہل کے خلاف، ایک طرح کی بغاوت پیدا کرکے، انسانی قدروں کی مدد سے، اخوت اور محبت کے مادّی فلسفے کو آگے کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ایک عالمگیر برادری کا تصور ابھرتا ہے اور جس کا ادراک صرف لمحاتی جذبات پر نہیں، بلکہ ان حقیقتوں پر ہوگا جو حرکت وعمل اور قوت حیات سے پائندہ ہوتی ہیں۔ اور اسی کے لئے شاید انھوں نے اوہام ادیان کے طلسم کو توڑنے کی کوشش کی تھی کہ دنیا کے مذاہب، صرف انسان کی وحدت کے قائل ہیں، باقی تمام باتیں فروعی ہیں۔ جہاں انھوں نے اپنی اسلامیات کی شاعری پیش کی ہے، وہاں اسلام کی ایسی فروعی باتوں سے بغاوت بھی کی ہے جو محض روایتی طور پر اوہام کے سہارے اسلام میں داخل ہوگئی ہیں، جنھیں مفاد پرست مولوی، اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے ہیں اور جنھیں اسلام کی اصل روح سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مگر ان باتوں کے خلاف آواز اٹھانا، خود کو مصیبت میں ڈالنا تھا، جیسا کہ یگانہ کے ساتھ واقعہ پیش آیا۔ تاہم جوش کی ایسی باغیانہ نظموں میں، ان نظموں کی روح کو تلاش کرنا چاہئے اور بقول جوش

الفاظ کے سر پہ نہیں اڑتے معنیٰ الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

جب جوش کی نظمیں، 'پیغمبر اسلام'، 'ذاکر سے خطاب'، 'متولیان وقفِ حسین آباد سے'، چھپیں، تو روایت پرستوں پر خاص ضرب پڑی۔ جوش کو ملحد اور زندیق کے لقب سے نوازا گیا، مگر اس کے علاوہ یہ حلقہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ جوش نے جس نہج سے ان کے "مذہب" کو ایک تجارتی ادارہ ثابت کرکے 'حسینی اور انقلاب'، 'مولوی'، 'فتنۂ خانقاہ'، 'متولیان وقفِ حسین آباد سے'، جیسی نظمیں لکھ کر، مذہب کے غلط ٹھیکہ داروں کا بناوٹی پردہ چاک کرکے، انھیں مذہب کی صحیح روح کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دی، اس نے اس حلقے کو سرمہ در گلو بنا دیا۔ اس طرح جوش کی اس سرمستی میں، ہشیاری کے عمل نے مذہبی انقلاب کی طرف بھی ایک قدم آگے بڑھنے کے لئے، عام انسان کو تیار کیا، جس سے اخوت، مساوات اور حریت کی طرف جوش کے یہ اقدامات، ایک آزاد اور بے ریا، انسانوں کی برادری بنانے کا فلسفہ بنتے ہیں۔ جس سے ایک طرح کی آفاقیت اور ہمہ گیر انسانیت کے خدوخال ابھرتے ہیں اپنی ایک نظم 'نیا میلاد'، میں جوش ایک ایسی دنیا کی بشارت دیتے ہیں جو توہمات سے پاک ہوگی جہاں، اخوت، مساوات اور حریت کا دور دورہ ہوگا اور جو عنقریب وجود میں آنے والی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس ضمن میں ملاحظہ ہوں ؎

آج لیکن عصر حاضر کا سماں کچھ اور ہے | اب زمیں کچھ اور ہے، اب آسماں کچھ اور ہے
ہاں وہی عالم کہ تھا مدت سے جس کا اشتیاق | آج پیدا ہو رہا ہے با ہزاراں طمطراق
شب کے اس دھندلے افق سے با ہزاراں آب وتاب | امن وآسائش کا طالع ہو رہا ہے آفتاب

ان بگولوں کو آدمی جکھ کر امر ہو جائے گا | آفتاب حبِ انساں جلوہ گر ہو جائے گا
اک الوکھی ضو سے دنیا جگمگا دی جائے گی | شمع بر تر آدمیت کی جلا دی جائے گی
جنگ کی بھٹی سے آنے ہی پہ ہے بادِ مراد | ارتقا پائندہ باد و نوعِ انساں زندہ باد

ایک دوسری نظم 'باغی روحوں کا کورس' میں یہی بات باغیانہ ڈھنگ سے پیش کی گئی ہے۔
آفریں یاد کہ اس جبرِ شریعت پہ بھی ہے | آفریں یاد کہ اس رعب نبوت پہ بھی ہے
آفریں یاد کہ اس خوفِ عقوبت پہ بھی ہے | آفریں یاد کہ اس دعوتِ جنت پہ بھی ہے
دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

مگر جوش اعتراضات، طنز، استہزا اور جھنجھلاہٹ سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ وہ اقبال کی طرح کی نظمیں، 'باغی مرید' 'پنجاب کے پیرزادوں سے'، اور 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'، جیسی جاندار نظمیں نہیں پیش کر سکے ایسے موقعوں پر جوش کو طنز و تمسخر اور مولویوں کا خاکہ اڑانے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ ان کے اشعار میں

میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد | زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن
(اقبال)

جیسی گہرائی اور کاٹ نہیں پیدا ہو پاتی۔ صرف مرض کی نشاندہی کرنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے بلکہ اس نظامِ فکر کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے جب کوئی فلسفۂ حیات، خود سماج کے اندر سے پھوٹے، سوشلسٹ نظام اس وقت تک وجود میں نہیں آیا جب تک سوسائٹی، خود اس کے لئے تیار نہیں ہو گئی اور یہ انقلابی تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب اندرونی طاقتیں خود بیرونی نظام کو اتار پھینکنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ پھر جوش کی مشکل یہ بھی ہے کہ ان کا طریق اظہار فکری نہیں بلکہ اظہاری اور ابلاغی ہے جو کبھی کبھی صرف محفل اور دلچسپ گفتگو ہی میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاید، ان کی انجمن سازی اور مجمع مدّاحاں نے نے انھیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کی ایسی شاعری سے فکری عناصر کے کم ہونے میں انجمن سازی' 'مجمع مدّاحاں' کا بڑا ہاتھ ہے۔ اسی صورت نے عجب نہیں کہ کف در حال ہیچ بھی ان کی شاعری میں

داخل کی ہو۔ کیوں کہ جس طرح سامعین اردو شعرا کی قدر و قیمت بڑھاتے ہیں اسی طرح انھیں اپنے مزاج اور دلچسپی میں ڈھال کر انھیں برباد بھی کرتے ہیں۔ اقبال نے شاید اسی وجہ سے ہمیشہ مشاعروں سے پرہیز کیا اور مصرعہ طرح میں شعر کہنے سے انکار بھی۔ جب بھی شاعر، اپنی فکر کا راستہ چھوڑ کر محض سامعین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے شاعری کرتا ہے، اس کی شاعری میں گہرائی باقی نہیں رہ جاتی۔ اس میں روز بروز لمحاتیت بڑھتی جاتی ہے اور چونکہ سیاسی اور ابلاغی مسائل میں اس کے امکانات بہت ہوتے ہیں، اس لئے، اس میدان میں طبع آزمائی کرنے والوں کو سامعین کی لمحاتی تحسین اور دلچسپیوں سے بہت بچ کر اپنی تخلیقات پیش کرنا چاہیے۔

جوش کی انقلابی شاعری پر، ایک حلقے سے، ہمیشہ سخت اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ سبب جو کچھ بھی ہو، کہا نہیں جاسکتا۔ جب کہ جگر صاحب کی شاعری، کو اس حلقے میں بڑی اہمیت دی گئی جوش کے خاص معترضین میں، علامہ اقبال سہیل، رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، اور خلیل الرحمٰن اعظمی شامل ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو ایک خاص ڈھنگ کی شاعری پسند نہ آئے۔ اقبال، جن پر اردو کی تنقیدی دنیا میں سب سے زیادہ کتابیں اور مضامین لکھے گئے، ترقی پسندوں کے حلقے میں، ان کی فکری عظمت پر ہمیشہ سوالیہ نشان لگایا گیا۔ ان کے مردِ مومن، شاہین اور 'وقت کے تصور، سب کو مستعار اور جانے کیا کیا کہا گیا۔ لیکن جوش پر جس ڈھنگ سے اعتراضات کئے گئے، ان کی نوعیت دوسری تھی۔ مجنوں صاحب نے تو یہاں تک لکھا کہ "جوش کی شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے۔" خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا کہ "چونکہ ان کی (جوش کی) مغربی ادب اور علوم کی اطلاع صفر کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں جہاں انگریزوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں، وہاں انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔" اس کے معنی ہوئے کہ تمام ہندی پریمی جو انگریزی تعلیم اور زبان کے مخالف ہیں یا رہے ہیں ان سب کی مغربی ادب اور علوم کی اطلاع صفر کے برابر ہے۔ ہندی والوں میں، ایسے مخالفین میں راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن، سیٹھ گوبند داس، مہادیوی ورما، سمترا نندن پنت اور یشپال بھی شامل ہیں۔ اور اردو والوں میں فی زمانہ، یہ سلسلہ، مولانا ابوالکلام آزاد، ساغر نظامی، نیاز فتحپوری روش صدیقی اور بہت سے لوگوں تک پہنچے گا۔ یہ صحیح ہے کہ جوش مغربی علم و ادب سے اس طرح واقف نہ تھے۔ جس طرح، یونیورسٹی کے اچھے گریجویٹ ان کے دور میں ہوا کرتے تھے لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ جو شخص مغربی علوم سے بہت زیادہ گہرائی سے واقف نہ ہو، وہ اردو کا اچھا شاعر یا مفکر نہیں ہوسکتا۔ یہ تو اسی طرح کی بات ہوئی کہ جب ابھی جدیدیت کی تحریک زوروں پر تھی تو یہ شرط لگائی گئی کہ جو ادیب یا

شاعر، فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے واقف نہیں وہ شاعر یا ادیب ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ایسی تمام تحریرں مردود قرار پائیں، جن میں صحیح یا غلط موقع پہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن یا اسپینی ادیبوں کے حوالے نہ ہوں یہ الگ بات ہے کہ حوالے دینے والے ان زبانوں سے واقعی واقف تھے یا نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ تمام جندی جو انگریزی زبان میں ایک جملے بھی صحیح نہیں لکھ سکتے تھے وہ فرانسیسی اور جرمن شعرا کے اس طرح حوالے دینے لگے جیسے ماں کو ان تمام زبانوں پہ کامل عبور حاصل ہے۔ جہاں تک جوش کی انگریزی تعلیم کی بات ہے، یہ سب کو معلوم ہے کہ انھوں نے آگرہ کے سینٹ پیٹرس، سے سینئر کیمرج تک تعلیم حاصل کی تھی جس کے معنی یہاں تک تو ہوئے کہ وہ انگریزی کتابوں کو خاصی روانی سے پڑھ سکتے تھے اور انگریزی خاصی روانی سے بول سکتے تھے (اس کا تجربہ آج کے کسی کانونٹ کے طالب علم سے گفتگو کر کے کیا جا سکتا ہے) مگر جوش اصولاً انگریزی بولنا پسند نہیں کرتے تھے کہ جب ہر ملک اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتا ہے تو ہندوستانی اور خصوصاً اردو کا طبقہ، اپنی مادری زبان میں گفتگو کیوں نہ کرے۔ یہ جوش کا دفاع نہیں ہے بلکہ جملۂ معترضہ کے طور پر یہ باتیں لکھ دی گئی ہیں۔ جوش نے اپنی انقلابی شاعری کے لئے کارل مارکس اور اینگلز کی تحریروں کا مطالعہ کیا تھا یا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں مگر پچھلے اوراق میں جو ہندوستان کی تحریک آزادی کے ساتھ، جوش کی نظم نگاری میں سے مثالیں پیش کی گئی ہیں، وہ ان کے عملی مطالعے کو تو ضرور ثابت کرتی ہیں۔ اس مسئلے میں کچھ لوگوں نے اقبال سے جوش کا مقابلہ کرنا چاہا ہے، جو مناسب نہیں۔ جوش اقبال کی بلندئ فکر اور شعری بلندی کو کبھی کبھی نہیں پہنچ سکے لیکن یہ بات صرف انگریزی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ دونوں کی طبیعتوں کی افتاد ہی الگ تھی۔ پھر فکر اور شعر میں اگر گہرائی پیدا کرنے کے لئے، انگریزی جاننا بہت ضروری ہوتا تو ہمارے بہت سے ادیب اور شاعر دو کوڑی کے بھی نہ رہ جاتے۔

'انقلابی شاعری کو فکر و فن کی شاعری ضرور ہونا چاہئے، کہ اس سے اس میں مختلف سطحیں اور مختلف الجہاتی پیدا ہوتی ہے۔ تاہم تھوڑی سی لمحاتی ہنگامیت بھی اس میں ہوا کرتی ہے۔ یہی وہ پہلا زینہ ہے جس سے بدلتے ہوئے وقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور جس کی ضرورت، ہر اس دور میں پڑتی ہے، جب ملکوں کی تقدیر بدلنے کا وقت آ پہنچا ہو۔ یہ صورت مایکا وسکی کے یہاں بھی ہے اور والٹ وہٹ مین اور آڈن سب کے یہاں ملتی ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں، یہ وہی وقت ہے اور اس لئے جوش کی ایسی شاعری، گہرائی نہ رکھنے کے باوجود، اس قومی انقلاب کو سہارا دیتی ہے جس نے ۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے، ملک کی تقدیر بدل دی۔ اس طرح جوش کی یہ انقلابی شاعری

انقلاب کی نقیب بھی ہے اور مددگار بھی۔ اور جنگ آزادی میں جب اردو شاعری کے حصے کی بات چلے گی تو جوش کی شاعری کا حصہ اسی طرح اہم ہوگا جس طرح بنگال کے انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کا حصہ، ہندی کے شعرا، میتھلی شرن گپت اور نوین کا حصہ اور بس۔ جوش کی ایسی انقلابی شاعری کو یہیں تک محدود رکھنا چاہیے۔

جوش کی سیاسی انقلابی نظموں میں گھن گرج ہے، موضوعات کے ساتھ، انھیں پیش کرنے کی ان میں بے پناہ صلاحیت بھی ہے لیکن ان سے کسی سیاسی بصیرت کا احساس نہیں ابھرتا۔ ان میں ہنگامیت یقینی طور پر ہے اور وقت اور اس کے مسائل کے بدلنے کے ساتھ ساتھ، ان کی حیثیت صرف تاریخی رہ جاتی ہے۔ یہ نظمیں شعری حسن سے عاری تو نہیں لیکن ان میں ادبیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ نہ 'خضرِ راہ' بنتی ہیں، نہ 'مسجدِ قرطبہ'، نہ 'ساقی نامہ'، یہاں تک کہ ان میں ٹینسن کے 'چارج آف دی لائٹ بریگیڈ' (CHARGE OF THE LIGHT BRIGADE) یا "ہاب یار" کی بھی کیفیت نہیں پیدا ہو پاتی۔ کبھی کبھی کی چیخ پکار، جھلاہٹ اور کسی حد تک بھرتی کے خیالات میں جوش کے طرزِ شاعری کو بھی کافی دخل ہے۔ جوش کو اطناب کا فن بہت پسند ہے۔ اطناب کی صورت، ان کے یہاں کبھی کبھی اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ اکثر وہ ایک ہی بات کو دس بیس طرح سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم 'کسان' میں سے جو بڑے معرکے کی نظم ہے، اس میں سے بیشتر اشعار اگر خارج کر دیے جائیں تو نظم شکل سے دس بارہ اشعار میں پوری ہو سکتی ہے اور سلسلۂ خیال اسی طرح قائم رہتا ہے۔ نفسِ مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہی صورت 'حسین اور انقلاب' اور 'موجد و مفکر'، 'طلوعِ فکر'، اور دوسری نظموں میں بھی ہے۔ لوگ جوش کو جب الفاظ کا جادوگر کہتے ہیں تو ان کا مطلب بھی اسی تطویل اور اطناب لفظوں کو بدل بدل کر ایک ہی خیال کو سو رنگ سے باندھنے سے ان کا مقصد ہوتا ہے۔ چنانچہ اپنی ایک نظم 'اعتراف' میں وہ خود اپنی کمیوں کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔

الاماں، آفاق کا دل اور یہ طغیانِ سوز — اب کھلا مجھ پر کہ اک طفلِ دبستاں ہوں ہنوز
میرے شعروں میں فقط اک طائرانہ رنگ ہے — کچھ سیاسی رنگ ہے، کچھ عاشقانہ رنگ ہے
کچھ مناظر، کچھ مباحث، کچھ مسائل، کچھ خیال — اک اچٹتا سا جمال، اک سر بزانو سا جلال
چند زلفوں کی سیاہی، چند رخساروں کی آب — گہ حریفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب
گاہ مرنے کے مراسم، گاہ جینے کی امنگ — بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ

تاہم ان کا خیال تھا کہ جب نئی دنیا، نئی نسل کے ساتھ آئے گی، تب اصل شاعری ہوگی اور میں تو اس اصل شاعری کا خالی نقیب ہوں۔

فکر میں کامل، نہ فن شعر میں یکتا ہوں میں کچھ اگر ہوں تو نقیب شاعر فردا ہوں میں

اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں الفاظ کو ایک خاص قدرت حاصل ہے۔ انقلابی نظموں میں تو یہ الفاظ، اس طرح، اکثر، خیال بستہ کو دیتے ہیں، کہ الفاظ کی جھنکار سے رن اور جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ میر انیس کا اثر ہو کر جوش پر انیس کی شاعری کا خاصا اثر ہے۔ انھیں الفاظ کے تمام DIMENSIONS ان کے صحیح صرف اور ان الفاظ کی کائنات سے ایک طرح کی امیج بنالینے پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ الفاظ، تصویر، جذبہ اور احساسات کے ساتھ ایک فکری ہیولے کی بھی تعمیر کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں، جذبہ، احساس اور متحرک پیکریت ان میں سے غائب ہو جاتی ہے، وہاں الفاظ کا یہ اجتماع محض ذخیرہ رہ جاتا ہے۔ دونوں طرح کی مثالیں ان کے یہاں موجود ہیں۔

بے زروں کی ڈوبی آنکھوں میں فاقوں کے نقوش اہل دولت کی جبینوں پر شقاوت کے نشاں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستاں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہے تدبیریں

کر دیا تونے یہ ثابت اے دلاور آدمی زندگی کیا موت سے لیتا ہے ٹکر آدمی
کاٹ سکتا ہے رگ گردن سے خنجر آدمی لشکروں کو روند سکتے ہیں کھلے سر آدمی
ضعف ڈھا سکتا ہے قصر افسر داورنگ کو آب گینے توڑ سکتے ہیں حصار سنگ کو

الفاظ کے اجتماع اور تواتر کی مثالیں بھی انقلابی نظموں میں ہیں، جن سے کوئی تاثر مترتب نہیں ہوتا۔

الاماں الحذر، میری کڑک میرا جلال خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں کٹار بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہسوار

زندہ مردوں کی ہے بستی کون سنتا ہے یہاں تا کجا، چیخا کروں، ہندوستاں، ہندوستان

لیکن جب جذبات میں ٹھہراؤ، فکر میں بصیرت، اور ایک عالمی اخوت کی دھیمی لہریں، جوش کے طویل نظم میں

پیدا ہوتی ہیں تو الفاظ کی یہی دنیا، ان کے تاثرات کو متشکل کر دیتی ہے۔ پھر نہ رجز کا موجزن دریا ہوتا ہے، نہ محفل سازی کی خواب آوری بلکہ ایک تاسف آمیز ادراک کا ریفلیکشن ان کی نظموں پر طاری ہوتا ہے جس میں بقول ایلیٹ، شاعر کی صرف اپنی آواز سنائی پڑتی ہے۔ ایسی نظموں میں 'ماتم آزادی'، 'گاندھی جی کے قتل پر لکھی ہوئی نظم'، 'سرد و خروش' اور 'سموم و صبا' کی اسی طرح کی دوسری نظمیں ہیں جنہیں انقلاب کی تہہ نشینی (EBBING) سمجھنا چاہیئے۔ ابتدائی انقلابی نظمیں، جوش کے شعری آہنگ اور جذبات کا چڑھتا ہوا دریا ہیں۔ اور آزادی کے بعد کی نظمیں، انقلابی کیفیات کا اتار ہیں جس میں تاسف اور امید و بیم کی ملی جلی کیفیت ملتی ہے۔ ایسے لمحات میں نہ تو الفاظ کا بے جا جماؤ ہوتا ہے نہ کف در دہاں چیخ، بلکہ جذبات کی سبک خرامی کے ساتھ الفاظ کی سوچتی ہوئی تصویریں بندوں میں متحرک نظر آتی ہیں۔ دو ایک مثالیں اس بات کی وضاحت کریں گی۔

فٹ پاتھ، کارخانے، ملیں، کھیت، بھٹیاں   گرتے ہوئے درخت، سلگتے ہوئے مکاں
بجھتے ہوئے یقیں، بھڑکتے ہوئے گماں   ان سب سے اٹھ رہا ہے، بغاوت کا پھر دھواں

اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ   وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

غدار تھے جو کل، وہ محبِّ وطن ہیں آج   بدخواہِ باغ، ہمدم سرو سمن ہیں آج
کل تک جو تھے سموم، نسیم چمن ہیں آج   خسرو کے جو غلام تھے، وہ کوہکن ہیں آج

لچھمن کا دل ہے شدتِ غم سے پھٹا ہوا
در پر ہے رام چندر کے راون ڈٹا ہوا

اس نامکمل سے مقالے میں، جہاں بھی انقلابی شاعری کی بات کہی گئی ہے، اس میں یہی پیش نظر رہا ہے کہ انقلاب سے جوش کیا سمجھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ، جوش کے دور میں، ہندوستان کے سیاست داں 'انقلاب' کا کیا مفہوم لیتے تھے۔ اصلاً یہ انقلاب، ایک محدود طریقے اور طبقے کا انقلاب ہے جسے اشتراکی انقلاب تک نہیں لے جانا چاہیئے بلکہ اسے صرف جنگ آزادی کے دوران، سیاسی کوششوں تک محدود رکھنا مناسب ہے۔ اسے ڈکٹیٹر شپ آف دی پرولیتاریٹ کے تصور انقلاب سے وابستہ کرنا مناسب نہیں۔ جوش کا جاگیردارانہ دور کا مزاج بھی، اس تبدیلی کو، ہندوستان کے مڈل کلاس، کی طرح 'انقلاب' سمجھتا رہا ہے۔ ڈکٹیٹر شپ آف دی پرولیتاریٹ کی منزل ابھی ہندوستان سے دور ہے۔ اس طرح اس مقالے میں جوش کی تمام انقلابی جدوجہد کو صرف اس تصور، ماحول اور فضا پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی تمام سیاسی اور انقلابی شاعری کی اسی مخصوص فکری جہت سے توجیہہ بھی کی گئی ہے۔ □

جوش ملیح آبادی

میرے پردادا
(فقیر محمد خاں گویا)

تہور جنگ حسام الدولہ نواب محمد فقیر خاں بہادر، گویا، ان کے دادا، یار بیگ خاں درۂ خیبر کے سرداروں میں سے تھے۔

یار بیگ خاں کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد نامدار خاں، اور چھوٹے کا محمد بلند خاں، نامدار خاں درّہ خیبر ہی میں رہے اور محمد بلند خاں آفریدیوں کے ایک قبیلے اور اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لے کر ۱۲۲۴ھ میں ہندوستان چلے آئے اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ انھوں نے اودھ کا رخ کیا اور لکھنؤ آ کر مقیم ہو گئے۔ اور جب نواب غازی الدین حیدر کے دربار تک رسائی کا موقع مل گیا تو نواب نے ان کو تین سو روپیہ ماہانہ پر فوج میں کوئی عہدہ دے دیا۔

ایک روز موقع پا کر محمد بلند خاں نے نواب سے کہا۔ میں آزاد قبائل کا فرد ہوں۔ کھلی ہوا میں رہنے کا عادی ہوں۔ شہر میں میرا دم گھٹتا ہے، مجھ کو اطراف لکھنؤ کے کسی ایسے قصبے میں زمین دے دی جائے کہ میں وہاں سے روز لکھنؤ آؤں اور فرائض منصبی انجام دے کر شام کو وہاں چلا جاؤں۔"

نواب نے کہا کہ آپ اطراف لکھنؤ میں کوئی قصبہ منتخب کر لیں وہ زمین آپ کو دے دی جائیگی۔"

محمد بلند خاں نے تمام قریبی دیہات اور قصبات کا دورہ کر کے کنول ہار کو پسند کیا۔ جو آفریدیوں کا گڑھ اور ملیح آباد کا ایک محلہ ہے۔ زمین ان کو دے دی گئی۔ اور انھوں نے وہاں ایک کچا مکان بنا کر بود و باش اختیار کر لی۔ اور اب ان کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح گھوڑے پر لکھنؤ جاتے اور شام کو کنول ہار پلٹ آتے تھے۔ کنول ہار میں انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کچھ روز کے بعد، ان کے بڑے بیٹے محمد عوض خاں تعلیم سے بددل ہو کر ریاست اندور

چلے گئے اور مہاراجہ ہلکر کی فوج میں رسالداری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کنول ہار سے چلتے وقت انھوں نے یہ چاہا کہ اپنے چھوٹے بھائی فقیر محمد خاں کو بھی جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی، اپنے ساتھ اندور لے جائیں۔ لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میری تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ میں تعلیم سے فراغت پاکر آپ کے پاس چلا آؤں گا۔

اس کے پانچ چھے سال کے بعد جب فقیر محمد خاں فارغ التحصیل ہو گئے تو بڑے بھائی کے پاس اندور چلے گئے اور بڑے بھائی نے ان کو بھی رسالداری کا منصب دلا دیا۔

اس کے کچھ روز بعد مہاراجہ ہلکر کو یہ خبر ملی کہ پڑوس کا ایک راجہ اندور پر چڑھائی کی غرض سے آیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجا ہلکر نے بگل بجوایا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ صبح ہوتے ہی دشمن پر حملہ کر دیا جائے۔ اسی رات کو فقیر محمد خاں نے بھائی سے کہا ــــ "بھائی صبح ہوتے ہی میدانِ جنگ میں اترنا ہے۔ دیکھئے نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ ان کی یہ بات سن کر بڑے بھائی کے دل میں بدگمانی پیدا ہو گئی۔ چھوٹا بھائی علم حاصل کرکے بزدل ہو گیا ہے اسے راتوں رات ہی کیوں نہ قتل کر دوں تاکہ خاندان کی عزت پر ضرب نہ آئے۔ لیکن برادرانہ محبت جوش میں آگئی۔ انھوں نے سوچا کہ جب میدانِ جنگ میں یہ دیکھوں گا کہ یہ لڑنے سے جی چرا رہا ہے اس وقت اس کا کام تمام کر دوں گا۔

لیکن صبح ہوتے ہی جب میدان کارزار گرم ہوا تو ان کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کا اٹھارہ سالہ چھوٹا بھائی صفوں سے آگے بڑھ بڑھ کر دشمن پر نیزہ بازی کر رہا ہے، یہ جواں مردی دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو گیا۔

فقیر محمد خاں نے اس راجا کا تعاقب کیا، بیس میل کا فاصلہ طے کرکے اسے گرفتار کر لیا اور مہاراجا ہلکر کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس واقعے کے بعد ڈنکے پٹ گئے دونوں بھائیوں کی بہادری کے۔ جب ان کی شجاعت کا غلغلہ راجپوتانہ سے سفر کرکے ٹونک پہنچا تو نواب امیر خاں والیٔ ٹونک نے مہاراجا ہلکر کے پاس برادرانہ خط بھیجا کہ ان دونوں بھائیوں کو مجھے دے دیجئے۔

مہاراجا ہلکر بڑے شش و پنج میں پڑ گیا، اگر ان دونوں کو بھیج دوں گا تو میری فوج میں پھر رہ کیا جائے گا اور نہیں بھیجوں گا تو نواب میر خاں سے بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور ان کے سے زبردست آدمی سے بگاڑ پیدا کر لینا خطرے سے خالی نہیں۔ ان تمام باتوں پر غور کرکے اس نے والیٔ ٹونک کو لکھا کہ میرے آپ کے برادرانہ تعلقات ہیں۔ آپ اگر میری اس تجویز کو مان لیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا کہ ان دونوں میں سے ایک بھائی محمد عوض خاں میری فوج میں رہیں اور

دوسرے بھائی فقیر محمد خاں آپ کے پاس چلے جائیں۔ نواب میر خاں نے یہ بات مان لی اور فقیر محمد خاں ٹونک چلے گئے۔ نواب میر خاں نے ان کو رسالدار بنا دیا۔ ٹونک میں اس وقت فارسی و عربی کے علماء کا ہجوم تھا، فقیر محمد خاں وقت نکال ان بزرگوں سے اکتساب علوم کرنے لگے۔

اس کے بعد نواب میر خاں اور انگریزوں کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اور چونکہ نواب میر خاں کے مانند فقیر محمد خاں بھی انگریزوں کے جانی دشمن تھے انھوں نے بڑے ولولے کے ساتھ لڑنا شروع کر دیا۔ پنڈارے انگریزوں کے مددگار اور گوروں کے دوش بدوش، نواب میر خاں کی فوج سے برسرپیکار تھے۔ پنڈاروں نے سوچا کہ اگر فقیر محمد خاں کو ہلاک کر دیا جائے تو نواب میر خاں کی فوج بھاگ کھڑی ہوگی۔ اس لئے ایک پنڈارے نے ان پر توپ چلا دی، گولہ ان کی ران میں لگا۔ گھوڑے سے گر پڑے۔ ایک پنڈارا تلوار سونت کر ان کی طرف بڑھا لیکن انھوں نے اس طرح نیزہ مارا کہ وہ گر پڑا۔ نواب میر خاں کی نظر پڑی۔ گھوڑا دوڑاتے آئے اور پنڈارے کا ایک ہاتھ میں کام تمام کر دیا اور چاہا کہ انھیں اٹھا کر گھر پہنچا دیں تاکہ فوراً مرہم پٹی ہو جائے لیکن فقیر محمد خاں نے کہا میں نے زخم کو کس کر باندھ لیا ہے، سپاہی جیتے جی لڑائی کا میدان نہیں چھوڑتا آپ یہ توپ میرے قریب کر دیں۔ میں بیٹھے بیٹھے دشمن پر گولہ باری کروں گا اور انھوں نے اس شدت کے ساتھ گولے برسائے کہ انگریزی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ جنگ ختم ہوتے ہی ان کی مرہم پٹی کی گئی اور دو تین مہینے کے اندر وہ زخم بھر گیا۔ نواب میر خاں نے خوش ہو کر، ان کا عہدہ بڑھا دیا اور بھائیوں کی طرح سلوک کرنے لگے۔

اس کے کچھ روز بعد نواب میر خاں نے فقیر محمد خاں کو حکم دیا کہ وہ جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کر دیں۔ جب انھوں نے جے پور اور اس کے بعد بھوپال پر حملہ کیا تو دونوں جگہ ایک ہی معاملہ پیش آیا۔ رانی جے پور اور بیگم بھوپال نے بانسوں پر اپنے اپنے دوپٹے بندھوا کر ہوا میں اڑانا شروع کر دیئے کہ ہم صلح پر آمادہ ہیں۔ فقیر محمد خاں کا جب سامنا ہوا تو رانی جے پور اور بیگم بھوپال دونوں نے یہ استدعا کی کہ ہم کو اپنی بہن بنا لیجئے اور انھوں نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ اسی دوران میں نواب میر خاں نے فقیر محمد کو بعض مسائل طے کرنے کی غرض سے اپنا سفیر بنا کر اودھ روانہ کیا، ان کی شجاعت اور فن جنگ کا غلغلہ اودھ اور نواب تک بھی پہنچ چکا تھا۔ جب وہ سفیر کی حیثیت سے نواب غازی الدین حیدر سے ملے اور سیاسی مسائل پر بحث چھڑی تو نواب اودھ نے کہا "خاں صاحب آپ خالی بہادر ہی نہیں ایک بڑے دانشمند اور ذی علم انسان بھی ہیں، میں آپ کو یہاں سے جانے

نہیں دوں گا۔" انھوں نے عرض کیا خداوند نعمت میں تو ایک مدت سے اودھ کا باشندہ ہوں۔ میرا باپ محمد بلند خاں آپ کی سرکار میں ملازم تھے وہ ملیح آباد میں موجود ہیں"۔ غازی الدین حیدر نے کہا پھر تو آپ حق بحق دار رسید کی طرح اپنے وطن ہی میں آجائیں گے۔

اس پر انھوں نے کہا "لیکن یہ بات آئینِ وفاداری اور اصولِ شرافت کے منافی ہے کہ میں والیِ ٹونک کی رفاقت کو ترک کر دوں۔"

نواب نے کہا خاں صاحب میں اس مسئلے کو حل کئے دیتا ہوں۔ اور ہرکارے کو حکم دیا کہ نواب معتمد الدولہ آغا میر (وزیر اودھ) کو حاضر کرے۔ آغا میر کے آتے ہی انھوں نے حکم دیا کہ اپنی جانب کی طرف سے نواب میر خاں کو خط لکھ کر فقیر محمد خاں کو مانگ لو۔ خط روانہ کر دیا۔ اور چند روز بعد آغا میر نے ان کو مطلع کر دیا کہ والی ٹونک نے ہماری بات منظور کر کے آپ کو اودھ میں رہ جانے کی اجازت دی ہے۔ انھوں نے کہا جب تک نواب میر خاں مجھ کو براہ راست خط لکھ کر اجازت نہیں دیں گے۔ میں اودھ کی ملازمت قبول نہیں کروں گا۔

اور جب تھوڑے دن میں ان کے پاس نواب میر خاں کا براہ راست خط آگیا تو انھوں نے شاہ اودھ کی پیش کش قبول کر لی۔ اور یہ عرض کیا کہ حضور خداوند نعمت کی ملازمت قبول کرنے سے پیشتر میری دلی تمنا یہ ہے کہ ملیح آباد جا کر اپنے باپ کی قدم بوسی کر آؤں۔"

غازی الدین حیدر نے آغا میر کو حکم دیا کہ فقیر محمد خاں کو ہاتھی پر ملیح آباد روانہ کیا جائے۔ تین سوار اور نقیبوں کی ایک ٹولی بھی ان کے ساتھ کر دی جائے اور جب وہ تزک و احتشام کے ساتھ ملیح آباد پہنچے تو نقیبوں کی ایک ٹولی ہٹو بچو فقیر محمد خاں بہادر کی سواری آرہی ہے کہ نعرے لگا رہی ہے تو وہاں کے پٹھان یہ سمجھے کہ کوئی بادشاہ ادھر سے گزرنا غالباً سندیلے جا رہا ہے۔

اور ان کے باپ نے جب سنا کہ نقیب فقیر محمد خاں کا نام لے رہے ہیں تو انھوں نے لوگوں سے کہا "ارے یہ تو میرے بیٹے کا نام ہے۔ یہ سن کر پٹھانوں نے قہقہہ مارا اور ایک صاحب نے بطور طنز یہ کہا جی ہاں آپ کا بیٹا بادشاہ بن کر آرہا ہے اور آپ کے کچے مکان میں دربار کرے گا۔"

اس پر محمد بلند خاں نے کہا "مسخرو سنتے کیا ہو اللہ کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔" اس کے بعد جب وہ جلوس محمد بلند خاں کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گیا تمام لوگ ادھر دوڑ پڑے اور حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فقیر محمد خاں کی نظر اپنے باپ پر پڑی۔ انھوں نے ہاتھی کے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں کیا دھم سے اس کے پیٹ پر سے "بادا بادا" کہتے کود پڑے، اور جا کر اپنے

باپ کے قدموں پہ سر رکھ دیا۔ باپ نے "ارے میرا فقیرا" کا نعرہ لگا کر بیٹے کو قدموں سے اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔

باپ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر کے جب وہ لکھنؤ واپس آئے غازی الدین حیدر نے ان کو پچیس ہزار سواروں کا رسالدار بنا دیا۔ اس کے کچھ دن بعد وزارت مال بھی ان کے سپرد کر دی اور اسی کے ساتھ ساتھ انھیں "سرکار خیرآباد" کا گورنر بنا دیا۔ اس کے دوش بدوش غازی الدین حیدر نے گولا گنج میں زمین کا ایک بڑا قطعہ بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اس قطعے کے انھوں نے دو ٹکڑے کر دیے ایک ٹکڑے کا نام "احاطہ پختہ فقیر محمد خاں" اور دوسرے احاطے کا نام احاطہ خام فقیر محمد خاں رکھ دیا۔ ملیح آباد سے ایک میل کے فاصلے پر انھوں نے مرزا گنج میں سیکڑوں ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے محل بنائے۔ آم کے باغ نصب کرائے۔

اسی اثنا میں ایک واقعہ پیش آیا، جس سے ان کے اخلاص اور ان کی شجاعت کے لکھنؤ کیا، پورے اودھ میں ڈنکے پٹ گئے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ان کے ایک مخبر خاص نے ان تک ایک زبردست سازش کی خبر پہنچا دی جو ان کے رفیق نواب معتمد الدولہ بہادر آغا میر وزیر اودھ کے خلاف تھی۔ اس سازش کے بانی تھے غازی الدین حیدر کے مقربوں میں سے ایک مرزا حاجی۔

مرزا حاجی نے دو راجپوتوں کو دس دس ہزار روپے رشوت دے کر اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ جب آغا میر شاہی طبیب حکیم واجد علی خاں کے بیٹے کی شادی میں شریک ہونے کے واسطے پرسوں ان کے وہاں جائیں تو تم پہلے ہی وہاں پہنچ کر دروازوں کے پٹوں کے پیچھے کھڑے ہو جانا اور جیسے ہی آغا میر دروازے میں قدم رکھیں تم دونوں بہ یک وقت حملہ کر کے ان کو قتل کر ڈالنا۔

یہ خبر پاتے ہی فقیر محمد خاں، آغا میر کے محل گئے۔ ان سے اس سازش کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا اور جب آغا میر حکیم صاحب کی لڑکی کی شادی میں شریک ہونے کی نیت سے روانہ ہوئے تو فقیر محمد خاں بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔ حکیم صاحب کے مکان کے سامنے پہنچتے ہی انھوں نے آغا میر سے کہا آج میں آگے آگے چلوں گا اور آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے۔ ان کی اس انوکھی درخواست سے آغا میر کے تمام رفقا دنگ ہو کر رہ گئے اور ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگا۔ آغا میر نے آنکھیں جھکا لیں اور تھوڑے سے توقف کے بعد کہا، خاں صاحب آپ کی تجویز منظور۔ بسم اللہ آپ آگے آگے چلیں۔ فقیر محمد خاں نے جیسے ہی دروازہ کے اندر قدم رکھا، راجپوت نے تلوار چلا دی، جس سے ان کا داہنا ہاتھ بری طرح زخمی ہو گیا اور جب فوراً تلوار سونت کر، انھوں نے راجپوتوں کو ڈانٹا تو ان کی آواز سنتے ہی ان کے ہاتھوں سے

تلواریں گر پڑیں، انھوں نے بھاگنا چاہا لیکن انھوں نے جھپٹ کر دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جب ان کی لاشوں کا معائنہ کیا گیا تو یہ دیکھا کہ ان راجپوتوں کے بازوؤں پر دس دس ہزار کے نوٹ تعویذوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں۔

آغا میر نے فقیر محمد خاں کو دوڑ کر، کلیجے سے لگالیا، ان کے زخمی ہاتھ کو بوسہ دے دے کر بار بار آنکھوں سے لگایا اور کہا خاں صاحب جب آپ نے میرے آگے آگے چلنے کی فرمائش کی تھی اس وقت میں بھانپ گیا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی بات ضرور ہوگی۔

اس کے بعد انھوں نے پوری سازش کا حال بتادیا۔ مرزا حاجی کو کھڑے کھڑے حبس دوام کی سزا دی گئی اور آغا میر نے ان کو گلے لگا کر کہا " خاں صاحب آپ نے اپنی جان پر کھیل کر، میری جان بچائی یہ مجھ پر آپ کا احسان ہے جس کو میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔" شاہ اودھ نے جب ان کا یہ کارنامہ ایثار سنا ان کی بے حد تعریف کی، سات پارچے کے خلعت سے نوازا اور نواب حسام الدولہ، تہور جنگ کا خطاب بھی عطا فرمادیا۔

ہر چند وہ آزاد قبائل کے ایک اکھڑ پٹھان تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب کو اس قدر جذب کر لیا کہ لکھنؤ کے قدیم نوابوں اور ان کے مابین کوئی فرق ہی باقی نہیں رہا تھا۔

ان کے محلوں کی سجاوٹ، ان کے ماکولات و ملبوسات کی نفاست، ان کی بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں، ان کے مشاعرے، ان کے شبستانوں میں راتوں کے مجرے، ان کی ادب نوازیاں اور اہل علم پر ان کی زر پاشیاں، ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں تھی جس سے یہ گمان ہوتا کہ وہ دینِ تہذیب میں ایک نومسلم کی طرح داخل ہوئے ہیں۔ میری دادی جان کہا کرتی تھیں کہ بیٹا تمھارے دادا جان کے وہاں اس قدر روپیہ تھا کہ اسے گننا ممکن ہی نہ تھا۔ اس لئے ترازوؤں میں تول تول کر روپیہ تھیلوں میں بھرا اور تہ خانوں میں رکھا جاتا تھا۔ لیکن تول کے باوجود یہ بات ان کو پسند نہ تھی کہ اپنے اخلاف کے واسطے گاؤں گراؤں یا کسی قسم کی کوئی جائداد غیر منقولہ ایسی چھوڑ جائیں کہ ان کے اخلاف دولت و عشرت کی فراوانی کے صید زبوں ہو کر اوصافِ انسانی سے محروم ہو کر رہ جائیں۔

ان کی یہ تمنا تھی کہ جس طرح تلوار کے زور سے میں نے بڑے بڑے محل تعمیر کر لئے ہیں اسی طرح میری اولاد بھی تلوار کی وساطت سے کمائے اور میری ہی طرح جی کھول کر مستحقین پر روپیہ برسائے۔

فقیر محمد خاں کے باپ بھی بڑے آن بان کے آدمی تھے، تمام عمر وہ اپنے کچے مکان میں

رہے بیٹے نے لاکھ لاکھ جتن کئے کہ باپ محلوں میں اٹھ آئیں، لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا اور کہا میں زنخا بننا پسند نہیں کرتا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فقیر محمد خاں کے باپ اپنے گھوڑے کو لنگوری چال (گھوڑے کی وہ چال کہ وہ زمین سے بلند ہو کر اچھلتا اور قوس سی بناتا زمین پر قدم رکھتا ہے) سے دوڑاتے ہوئے چوک سے گزر رہے تھے اور جب ان کا گھوڑا ایک طوائف کے چھجے کی طرف بلند ہوا تو نوچی نے نائکہ سے پوچھا "یہ سوار کون ہے" نائکہ نے کہا چپ رہ یہ نواب فقیر محمد خاں بہادر کے باپ ہیں۔"

یہ سن کر وہ غصے میں بھرے ہوئے گھر آئے اور بیٹے سے کہا "فقیرے! اب میں زندگی بھر چوک سے نہیں گزروں گا۔" بیٹے نے سبب پوچھا تو انھوں نے سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد کہا "دنیا کا قاعدہ ہے کہ بیٹا، باپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور آج یہ الٹی گنگا بہی کہ باپ کو بیٹے کے نام سے پہچانا گیا ہے، لعنت ہزار لعنت چوک سے گزرنے والے پر۔"

ایک بار فقیر محمد خاں کے مہتمم "باغات" نے ان کی خدمت میں لکھا کہ حضور کے والد ماجد جب باغات تشریف لاتے ہیں تو پٹھانوں کے غول کے غول ان کے پیچھے آتے اور ہزاروں کچے پکے آم توڑ کر لے جاتے اور پودوں کی شاخیں بھی توڑ ڈالتے ہیں۔"

یہ خبر سن کر فقیر محمد خاں نے اپنے باپ کے نام لکھنؤ سے ملیح آباد یہ خط بھیجا کہ باوا تمام باغ آپ کے ہیں آپ کو ان پر کامل تصرف حاصل ہے۔ آپ باغوں میں جتنے آدمی چاہیں، اپنے ساتھ لے جائیں۔ لیکن آپ کے علم کے بغیر جو لوگ آپ کی آڑ لے کر، باغوں میں گھس جاتے اور نقصان پہنچاتے ہیں، ان کے متعلق میں نے مہتمم باغات کو لکھ دیا ہے کہ انھیں باغ میں نہ جانے دیا جائے۔"

بیٹے کا یہ خط پڑھ کر وہ جامے سے باہر ہو گئے، اپنے بھانجے سے کہا فقیرا امیر ہو کر دیوانہ ہو گیا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ جو لوگ میرے پیچھے پیچھے باغوں میں آنا چاہیں ان کو روک دیا جائے۔ چلو میرے ساتھ میں آج فقیرے کو مزا چکھا دوں گا۔"

فقیر محمد خاں اپنے محل میں شاہزادوں اور عمائد لکھنؤ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ چوب دار نے عرض کیا کہ سرکار کے والد محترم غصے میں بھرے ہوئے اپنے بھانجے سے یہ کہتے تشریف لا رہے ہیں کہ میں آج اسے مزا چکھا دوں۔"

فقیر محمد خان نے یہ سنا تو گھبرا گئے اور حاضرین سے کہا میں اس بڑی الماری کے پیچھے

جاکر چھپ جاؤں گا، باوا تشریف لائیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں اس وقت کہیں باہر گیا ہوا ہوں۔" اتنے میں بپھرے ہوئے محمد بلند خاں آ گئے۔ تمام محفل کھڑی ہو گئی انھوں نے پوچھا فقیرے کہاں ہیں؟" حاضرین نے کہا "کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں محمد بلند خاں نے کہا خوشامد خورد جھوٹ نہ بولو اور صاف صاف بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

خوشامد خوروں کا لفظ سن کر تمام ارباب محفل دنگ رہ گئے۔ لیکن حضرت گریلے کے پاس خاطر سے کسی نے کوئی ناشائستہ جواب نہیں دیا۔

اتنے میں ایک تند جھونکا آیا، اور فقیر محمد خاں کا الٹا دامن دیکھ کر، محمد بلند خاں کے بھانجے نے الماری کی طرف اشارہ کر دیا۔ محمد بلند خاں الماری کی طرف جھپٹ پڑے، بیٹے کو کھرا کر الماری کے پیچھے سے نکالا اور گریبان پکڑ کر کہا تیری یہ مجال کہ میرے ساتھ باغوں میں جانے والوں کو روک دے، یہ کہتے ہوئے ان کے منھ پر تڑاق سے طمانچہ مار دیا۔ اور جب طمانچہ کھا کر انھوں نے سر جھکا لیا تو محمد بلند خاں کے بھانجے نے کہا ماموں بس اس سے زیادہ اور ذلیل نہ کیجئے۔"

اور جب محمد بلند خاں بیٹے کو بھری محفل میں ذلیل کرنے کے بعد جانے لگے تو بیٹے نے باپ کے قدم پکڑ لئے اور کہا "باوا معاف کر دیجئے اور پھر باپ نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور پورے اودھ میں غلغلہ بلند ہو گیا۔ فقیر محمد خاں کی بے نظیر شرافت و سعادت مندی کا۔ اور شعرا نے ان کی سعادت مندی کی تعریف میں قصیدے کہے اور انھوں نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔

ماخوذ "یادوں کی برات"

مولوی احمد حسین

میں نے زندگی میں دو ایک کے علاوہ ان کا سا پُر اسرار و صاحب کردار انسان آج تک نہیں دیکھا ہے۔ ان کی دنیوی حیثیت تو بس اس قدر تھی کہ وہ سرکار نظام میں غالباً تیس روپے ماہانہ کے ایک معمولی کلرک تھے، لیکن ان کی انسانی حیثیت اس قدر ارفع تھی کہ ایک میرا سا بیگانۂ یقین و بے عقیدہ شخص، یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کروڑوں انسانوں سے کہیں دو ایک کو اس قدر بلندی حاصل ہوتی ہے۔ عربی، فارسی، علم کلام اور فلسفے پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی، لیکن افتادِ

مزاج کی بنا پر وہ تصوف کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی کائنات کے حقائق، اور وحدت الفس و آفاق کے مسائل پر اس قدر ژرف نگاہی کے ساتھ روشنی ڈالا کرتے تھے کہ ان کی بوسیدہ چٹائی پر بیٹھ کر تخت طاؤس نگاہوں سے گر جاتا تھا۔

میں سب سے پہلے ان کی اعلائے کلمۃ الحق کی جرأت بیباک کا ایک عجیب واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں، لیکن وہ واقعہ ہوا تھا کس ماحول میں جب تک آپ کو اس کا علم نہیں ہوگا اس وقت تک آپ اس واقعہ کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکیں گے۔

اس لئے اس امر کا بتا دینا ضروری ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ہز اکزالٹیڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں بہادر نظام دکن کی ذات سے ہے۔

یوں تو دیسی ریاستوں کا ہر مطلق العنان فرمانروا جہالت پروردگی، گرم و سرد نہ چشیدگی، ہمہ وقت آرامیدگی، خوشامد گزیدگی، ذہن ژولیدگی، اور آمریت بیوستگی کے باعث اس قدر متکبر ہوتا تھا کہ فراعنہ کا تبختر اور ہامان و شیطان کا غرور ان کو دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔ لیکن نظام۔ اللہ اکبر، جس طرح ان کی ریاست ہندوستان کی تمام ریاستوں سے بڑی تھی اسی طرح وہ تمام والیان ریاست سے عجب و غرور میں سب سے زیادہ قد آور انسان تھے، اور انسان نہیں خدا معلوم ہوتے تھے اور ان کے روبرو بڑے بڑے ہمالیہ کوب انسانوں کی پنڈلیاں کانپنے لگتیں اور بڑے بڑے سورماؤں کے زہرے آب ہو جایا کرتے تھے۔ اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ نظام کا طنطنہ اور دبدبہ کس قدر شیر افگن تھا اب سنئے، تیس روپلی ماہانہ کے ایک معمولی سے کلرک، مولوی احمد حسین کا واقعہ۔

حیدرآباد کی درگاہ میں جس کا نام ہے "خواجہ کا چلّا" بڑے دھوم دھڑکے سے ہر سال قوالی ہوا کرتی تھی اور کبھی کبھی نظام بھی آیا کرتے تھے ـــ چنانچہ ایک بار وہاں پہلی صف میں نظام اور دوسری صف میں عین نظام کے پیچھے مولوی احمد حسین بیٹھے ہوئے تھے کہ حسب دستور قوالی سے پیشتر قرأت ہونے لگی اور خوش گلو قاری نے سورۂ رحمٰن جو قرآن کی جان ہے اس طرح پڑھنا شروع کر دی کہ تمام محفل جھومنے لگی۔

ابھی تمام اربابِ درگاہ، قرأت کے جھولے میں جھول رہے تھے کہ نظام مہاراجا کشن پرشاد سے کچھ سرگوشی کرنے لگے۔ رعب شاہی سے قاری کے رشتۂ آواز میں جھنگی پیدا ہو گئی اور قرأت ہکلانے لگی۔

کس کی مجال تھی کہ نظام کو ٹوک دیتا۔ مگر واہ ری جرأت مردانہ کہ احمد حسین کے سے مسکین
دمی نے جھک کر نظام سے کہا کہ اثنائے قرات میں باتیں کرنا سوء ادب ہے۔ آپ خاموش ہو جائیں۔
ظام نے مڑ کر ان کو دیکھا ـــــ ونکٹارا ما ریڈی کو توال شہر جو پولس دستے کے ساتھ نظام سے
دبر رہات باندھے کھڑا تھا، ان کی طرف گرفتار کرنے کے واسطے جھپٹا ـــــ لیکن نظام ـــــ نے
و۔ نکو۔ (نہیں ـــ نہیں) کہہ کر اس کو روک دیا۔

قاری کی رندھی آواز کھل گئی، قرأت پھر پینگ لینے لگی اور لوگ جھومنے لگے۔ لیکن ایک
نصرے وقفے کے بعد نظام نے مہاراجا کشن پرشاد سے پھر سرگوشی کا آغاز کر دیا۔ یہ دیکھ کر
ہ بپھر گئے پہلے تو انھوں نے "سوء ادب" ہی کہا تھا، اس بار انھوں نے بآواز بلند کہا "اثنائے
أت میں باتیں کرنا بدتمیزی ہے، خاموش ہو جائیے اور مزید بدتمیزی نہ کیجیے۔"

ان کی یہ آواز سن کر حاضرین تھرا اٹھے، قاری کی آواز گلے میں دفن ہو گئی، کوتوال پھر جھپٹا
ام "نکو نکو" ان کو گرفتار نہ کرو۔ ان کا نام اور پتہ لکھ کر ابھی کنگ کوٹھی آجاؤ کہہ کر کھڑے ہو گئے
مہاراجا کشن پرشاد کو ساتھ لے کر درگاہ سے چلے گئے۔

تمام حاضرین محفل اس دبلے پتلے مسکین مولوی احمد حسین کو دیکھنے کے لئے جس کی بوسیدہ
وانی کی آستینوں سے اس کی کہنیاں جھانک رہی تھیں اس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت میں
بی ہوئی تعریف کرنے لگے۔

لوگوں کی مدح سرائی کے جواب میں انھوں نے یہ کہا کہ آپ حضرات نے یہ قول سنا ہے کہ
ل کی موت نے، مجھ کو بڑا بنا دیا ہے؟ میاں پہلے سارے مسلمان ایسے ہی تھے، اب چونکہ وہ
ـ باقی نہ رہے اس لئے میں نیک نمایاں فرد معلوم ہونے لگا ہوں، اور کوتوال جب ان کا نام
پتہ پوچھنے آیا تو انھوں نے اپنا نام اور پتہ بتانے کے بعد، اس سے یہ کہا کہ بہتر تو یہ ہے کہ
گرفتار کر لو، اور پھانسی کے تختے پر لٹکا دو کہ سچ بولنے والے کا ہمیشہ یہی انجام ہوا کرتا
۔ کوتوال ان کو حیرت سے دیکھنے لگا، اور اس کا کوتوالی کا گٹھا ہوا دبدبہ، پلپلا ہو کر اس کے
ملے ہوئے منھ پر لٹکنے لگا۔

ابھی درگاہ سے آکر وہ گھر میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک وردی پوش نے آکر کہا۔ مہاراجا
ن پرشاد بہادر تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے کہا بلالو۔ مہاراجا نے ان کے سامنے ایک ایک
لے دس توڑے رکھ کر کہا مولوی صاحب، یہ دس ہزار روپے سرکار والا تبار نے آپ کی

جرأت ایمانی سے خوش ہوکر آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں، انھیں قبول فرمالیجئے۔

انھوں نے بڑی مسکنت سے کہا سرکار تک میرا شکریہ پہنچا دیجئے میں ان کا ایک ادنیٰ سا نمک خوار ہوں، یہ ان کی شرافت کی بڑی دلیل ہے کہ سزا کے عوض وہ مجھ کو جزا دے رہے ہیں۔ لیکن مہاراج، سرکار کی خدمت میں جاکر عرض کر دیجئے کہ کلمۂ حق فروختنی نہیں ہوا کرتا، اس لئے میں یہ روپیہ قبول نہیں کر سکتا۔ مہاراجا نے ان کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ فرطِ جذبات سے کچھ بول نہ سکے، ان کے ہاتھ چوم لئے اور سر جھکا کر رخصت ہو گئے۔

اس کے بعد شاہی فرمان نکلا کہ مولوی احمد حسین کو نوکری سے سبکدوش کر کے گھر بیٹھے تین سو روپئے تاحیات دیئے جائیں، اس کو بھی انھوں نے قبول نہیں کیا، اور یہ لکھ بھیجا کہ میری نوکری بحال رکھی جائے، میں تیس روپے ماہانہ میں اچھی زندگی بسر کر رہا ہوں، مجھ کو تین سو روپے کی ضرورت نہیں۔

دیکھا آپ نے اس ہڈیوں کے ڈھانچے کا آہنی کردار؟ اس صدی میں اگر ان کا کوئی ہمسر گزرا ہو تو خدارا مجھے اس کے نام سے آگاہ کیا جائے۔

وہ مجھ سے محبت کرتے تھے اور میں دل ہی دل میں اپنے سے کہا کرتا تھا ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

ہمارے مابین بظاہر کوئی وجہ اشتراک نہیں تھی وہ تھے مناجاتی اور میں تھا رندِ خرابات خدا جانے وہ کون سی ادا تھی، جس نے ان کا دل موہ لیا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ آپ کا تمام کلام الہامی ہے اور آپ کی شراب نوشی مراقبہ ہے۔ حالانکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ میری شاعری الہامی ہے اور نہ میری شراب نوشی مراقبہ ہے۔

(یادوں کی برات سے) □

انتخاب

کلامِ جوشؔ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؛
"دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
ن کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیئے کو مار دو گولی پئے امن و بقا
غِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں
ھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر"

ت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی بابت کرتے ہو فکر
ب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
دیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
بِ ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
تے پھرتے تھے تم جب کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
ت کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
نتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی، تمھارے ہاتھ کی لائی ہوئی
اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے؟

تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے تم لائے تھے سر شاہ ظفر کے سامنے؟

یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں؟
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں

تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا

سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ؟
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمھیں جلیان والا باغ بھی؟

پوچھ لو اس سے تمھارا نام کیوں تابندہ ہے؟
"ڈائر" گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے؟

وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟

اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے؟
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے

اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا

آج کشتی امن کے امواج پر کھیتے ہو تم
سخت حیراں ہوں کہ اب کیوں درسِ حق دیتے ہو تم؟

اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
"بینکی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم

اہلِ حق روشن نظر ہیں، اہلِ باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کمزور ہیں

آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں؟

کیا کہا انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں؟

گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفا خانے میں ہے؟

آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟

سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے

ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسینؑ

خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

———

میرا مرثیہ

مجھے اے ہم نشیں اس زندگی نے
ہنسایا جب تو رونے کو ہنسایا

ارے اس عالمِ تعجیل خو نے
یہاں مجھ کو بہت پہلے بلایا

جہاں سو سال بعد آنا تھا مجھ کو
وہاں سو سال پہلے کھینچ لایا

مجھے گونگوں کی محفل میں جگہ دی
مجھے سوتوں کے حجرے میں جگایا

مجھے دیووں کے جنگل میں اتارا
مجھے بھوتوں کے کنڈل میں بسایا

مجھے بونوں کے پہلو میں جگہ دی
مجھے مردوں کی ارتھی پر بٹھایا

مجھے اوہام کی بھٹی میں جھونکا
مجھے اقوال کی لو پر جلایا

مجھے اندھوں کی محفل میں سنوارا
مجھے بہروں کے حلقے میں بجایا

جہاں فکرِ جواں اگتی نہیں ہے
مرا اس خاک پر پودا اُگایا

ہزاروں بار مجھ پر مفتیوں نے
بگڑ کر کفر کا فتویٰ لگایا

کمر میرے تجسس کی جھکا دی
گلا میرے تفکر کا دبایا

مرے افکار پر کی سنگ باری
اور اتنی کوئی پھل رہنے نہ پایا

مرے اشعار جھنڈے پر چڑھائے
مرے انکار کو نکو بنایا

یہ زعم خویش نافہموں نے اکثر
مری تحلیل کی مجھ کو جھکایا

ہر اک سقراط آنکھیں بند کر کے
مری نادانیوں پر مسکرایا

اکٹھا ہو گئے جب چند بقراط
اشاروں سے مجھے گھامڑ بتایا

میں تھا بھی شاید اک ایسا معمہ
کہ یاروں کی سمجھ ہی میں نہ آیا

ستا سکتی نہیں اتنا اجل بھی
مجھے اس عمر نے جتنا ستایا

اٹھائی خود ہی میں نے لاش اپنی
ارے اتنا مجھے اتنا جلایا

انھیں بخشی وہ خوئے جاں نوازی
کہ عہدِ شوق میں مرنے نہ پایا

بنا عشق ایک رسمِ وضع داری
زمانِ شوق کو اتنا بڑھایا

پڑی وہ وقت کی ضربیں مسلسل
کہ عشق اپنے لہو میں خود نہایا

بجھا کر شعلۂ رخسارِ جاناں
کہ مرے احساس میں لوکا لگایا

لب و رخسار پر کی برف باری | اور اتنی اک شرر بجھنے نہ پایا
رخِ شاداب کی صبحِ طرب پر | غم آگیں جھٹ پٹے کا رنگ چھایا
جو طاقِ خال و خد میں جل رہے تھے | تہِ جلد ان چراغوں کو بجھایا
شبِ آخر کی ڈھلتی چاندنی نے | مرتب سطحِ دریا کو ہلایا
زلیخا دھاریوں کو چور کر کے | گلابی پنکھڑی کو کھردرایا
سبک چلکے کی ڈوری توڑ ڈالی | سجل مکھڑے کے خیمے کو گرایا
قیامت ہے کہ پائے تیرگی پر | مرے ماہِ جبیں نے سر جھکایا
جہاں جلتے تھے پر وقتِ رواں کے | وہاں طوفان ماہ و سال آیا
مرے اشعار مرکز سے ہٹائے | مرے نغموں کو پردیسی بنایا
مری نظروں کے کنگن توڑ ڈالے | مری تخئیل کا زیور بڑھایا
جو تھی برکھا کی راتوں کا نشیمن | مجھے اس زلف میں تنکا دکھایا
گلے پر حصر ہے جن کے سخن کا | مجھے پیہم کلام ان کا سنایا
ارے نادان نقادوں کے ہاتھوں | مری نظموں کو سولی پر چڑھایا
انھیں میرا بنایا دشمنِ جاں | جنھیں میں نے کلیجے سے لگایا
مجھے قصرِ سلاطیں میں بٹھا کر | مری خودداریوں کا منھ چڑھایا
مری حالت پہ طاری کی گدائی | مری فطرت کو شاہانہ بنایا
مری ہر شام کو تسکین دے کر | مری ہر صبح کو در در پھرایا
جو تھا مجھ میں غرورِ کبریائی | بحدِ بندگی اس کو گرایا
مورّخ تھے جو میری زندگی کے | انھیں جن جن کے دنیا سے اٹھایا
مرے گلزار میں کانٹے اگائے | مرے شعلوں کو خاکستر بنایا
لگا کر آگ میرے خال و خد کو | اور اس کے بعد آئینہ دکھایا
جب ایک بوڑھا سا آئینے میں دیکھا | میں رو دیا قہقہہ سب نے لگایا
بتوں نے پھیر لیں مجھ سے نگاہیں | زمانے نے مجھے یہ دن دکھایا
یہاں المختصر ابرِ مسرت | جو چھایا بھی تو کچھ اس طرح چھایا
دہکتی خاک پر جس طرح پل بھر | کسی اڑتے ہوئے طائر کا سایا
نفس کی آمد و شد اللہ اللہ | مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا

مقامِ رندی

سبو اٹھا کہ فضا نیم خام ہے ساقی
فراز چرخ پہ ماہِ تمام ہے ساقی

فلک پہ غلغلۂ دل نواز رنگ
زمین زمزمۂ جشن عام ہے ساقی

نہ ہاتھ روک خدارا دہر میں اب تک
ریا حلال ہے، صہبا حرام ہے ساقی

جھکی ہوئی ہے صراحی، چھنے ہوئے ہیں سبو
نیا قعود، نرالا قیام ہے ساقی

بتوں میں بھی ہیں بہت حوریاں تصورات
یہاں بھی سلسلۂ صد خیام ہے ساقی

زوالِ عقل ہو جس سے وہ آبِ تاک حرام
جو اور ہوش میں لائے وہ جام ہے ساقی

جنوں کی پشت پہ ہو فکر تو جنوں ہے غلط
نرا جنوں ہو تو سودائے خام ہے ساقی

بنامِ آدم و حوا پلا کہ گرم سرود
نسیم روضۂ دارالسلام ہے ساقی

مرورِ ربط دے کی پیر عنایت کر
کہ تیغ ارض و سما بے نیام ہے ساقی

یہ قول تجھ کو بھی شاید پسند آئے گا
جھکے نہ دل تو عبادت حرام ہے ساقی

بساطِ رنگ پہ لا کر ثوابت و سیار
فضا پہ کون یہ گرمِ خرام ہے ساقی

بجا وہ طلبِ منصبِ الوہیت
ازل سے ذہنِ بشر تند گام ہے ساقی

نہ اسم و جسم، نہ نفس نہ سایہ و نقل
یہ کیا دیار ہے یہ کیا مقام ہے ساقی

ربابِ فرش پہ رکھ دے کہ جوش ہے اس وقت
ضمیرِ عرشِ بریں ہم کلام ہے ساقی

متاعِ دو جہاں

فتنۂ دوراں سے اماں دیتا جا
کاہِ بے مایہ کو بھی کاہکشاں دیتا جا

اے مرے کوئے ظریفاں سے گزرنے والے
ان گداؤں کو بھی اندازِ شہاں دیتا جا

خس و خاشاک و خزف کو بھی مرے ابرِ کرم
موجۂ کوثر و گلزارِ جناں دیتا جا

یاں بشکرِ دلِ جوالہ و لعل
نفسِ زندہ احساسِ جواں دیتا جا

جس سے مردانِ سبک روح کو ملتی ہے نظر
دوشِ تخئیل کو وہ رطلِ گراں دیتا جا

پردۂ گل میں بصد ناز، چھکنے والے
خارِ لب بستہ کے منہ میں بھی زباں دیتا جا

اے مرے مطربِ محرابِ حریمِ الہام
طبع کو زمزمۂ آبِ رواں دیتا جا

اے خدیوِ ادب و شاہ سوارِ گردوں
دستِ فن کار میں گیتی کی عناں دیتا جا

اے بہر گام چھلکتے ہوئے سروِ شاداں
غم پہ جو تیر چلائے وہ کماں دیتا جا

تجھ کو اس لرزشِ مژگاں کے دھندلکے کی قسم
دل جو بیندہ و چشم نگراں دیتا جا

ہاں گدایانِ خرابات کو اے
منصبِ خواجگیٔ کون و مکاں دیتا جا

اے شناسندۂ اسرارِ حیاتِ ابدی
موجِ انفاسِ مسیحا دیتا جا

ہاں رگِ جاں کو بیک جنبشِ مضرابِ گناہ
لرزشِ زیر و بمِ نغمہ گراں دیتا جا

ہاں یہ بت کدۂ محتسباں و فقہا
جرأتِ بندگیٔ پیرِ مغاں دیتا جا

اپنے آہنگِ ریا کوب کی تجھ کو سوگند
بانگِ قل قل کے منارے پہ اذاں دیتا جا

صرف اک موجِ تبسم سے بہ اندازِ سحر
شب نشینوں کو متاعِ دو جہاں دیتا جا

جوش کے سنگِ درِ کفر کو اے مست خرام
دولتِ سجدہ صاحب نظراں دیتا جا

رباعیات

خود کو نہ کبھی فریب دینا اے دل
ناؤ نہ اس بحر میں کھینا اے دل
ناکامیٔ شناقصانِ عالم کی قسم
تعریف کا زہر چکھ نہ لینا اے دل

ہم بند کئے دل کے تقاضوں کی دکاں
تم قلب پہ لادے ہوئے اربوں ارماں
تم کثرتِ دولت کی بنا پر ہو گدا
ہم قلتِ حاجات کے بل پر سلطاں

گر روح میں بابِ کفر و ایماں مسدود
وہ فہم کی وحشت ہے یہ دانش کا جمود
انکار بہ ایں دماغِ کمزور و علیل
اقرار بہ ایں عقلِ ضعیف و محدود

انساں پہ ہے کس درجہ خرافات کا بار
دن کا ہے کبھی وزن کبھی رات کا بار
پیدا ہو بشر میں کیا حکیمانہ مزاج
عقلوں پہ ہے صدیوں کے روایات کا بار

کل صبح اٹھا باغ میں جب پردۂ خواب
اللہ ری نزاکتِ دلِ خانہ خراب
انفاس اٹھا سکے نہ بارِ خوشبو
پلکوں سے سنبھل سکا نہ بارِ مہتاب

نوخاستہ شاعرو ٹھٹھر جاؤ گے
تقلید یوں ہی رہی تو پچھتاؤ گے
جب تک مجھے گم نہیں کرو گے بچو
کہتا ہوں کہ اپنوں کو نہیں پاؤ گے

لیلائے سخن کے گیسوؤں کو سلجھاؤ
جو میں نہیں کر سکا وہ تم کر کے دکھاؤ
اللہ کرے میرے کمسن شاعرو
تم مجھ سے ہزار چند آگے بڑھ جاؤ

کسے آواز دوں

کس کو آتی ہے مسیحائی کسے آواز دوں
بول اے خونخوار تنہائی کسے آواز دوں
بڑھتے بڑھتے بڑھتے بڑھتے تھک گئی ہیں پتلیاں
بجھ رہی ہے شمعِ بینائی کسے آواز دوں
چپ رہوں تو ہر نفس ڈستا ہے ناگن کی طرح
آہ بھرنے میں ہے رسوائی کسے آواز دوں
ہائے اس غربت کے جنگل میں پکاروں تو کسے
کس سے ہے میری شناسائی کسے آواز دوں
یہ جماہی پر جماہی الحفیظ والاماں
اف یہ انگڑائی پہ انگڑائی کسے آواز دوں
اف خموشی کی یہ آہیں دل کو برماتی ہوئی
اف یہ سناٹے کی تنہائی کسے آواز دوں

چل رہے ہیں زندگی پر چاندنی کے نیشتر
چبھ رہی ہے دل میں پروائی کسے آواز دوں

جوش کے بارے میں جناب سردار جعفری کے تاثرات

(سردار جعفری کے خطوط سے اقتباسات)

اس وقت جوش ملیح آبادی پر کوئی مضمون لکھنا میرے لئے ممکن نہیں۔ میں جوش پر اپنی کتاب "قبلۂ زندانِ جہاں" مکمل کر رہا ہوں جو تین ابواب پر مشتمل ہے:۔ (۱) جوش کی شاعرانہ شخصیت (۲) جوش کی صہبا پرستی (۳) جوش کی انقلابی رومانیت ــــ یہ کتاب بیسویں صدی کے ادارے سے شایع ہوگی۔

اگر آپ "الفاظ" کا کوئی جوش نمبر نکال رہے ہوں تو اس میں میری کتاب "ترقی پسند ادب" سے جوش والا حصہ نکال کر شایع کر لیجئے۔ وہ ۱۹۵۱ء کی تحریر ہے۔ میری رائے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ صرف عقیدت اور محبت میں اضافہ ہوا ہے اور جوش کی عظمت کا احساس زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔ انھوں نے طوفانِ حوادث میں بھی اپنا سر بلند رکھا اور کج کلاہی کی ادا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج جوش نئی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں ان کی عزت اور عظمت بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان جوش کی شاعرانہ عظمت کو صحیح طور سے محسوس کرنے میں کچھ زیادہ وقت لے گا۔

جوش کے افکار کو پائے گی مستقبل کی روح ــــ آج اگر رسوا یہ مردِ نامسلماں ہے تو کیا

سردار جعفری

شاعرِ انقلاب اور قبلۂ زنداں جہاں نے سخت سے سخت حالات کے باوجود آخر تک اپنا سر نہیں جھکایا، صرف آتی فریاد کی ــــ "اے مری خونخوار تنہائی کسے آواز دوں" اور آنے والی نسلوں کے لئے یہ اطلاع فراہم کی ــــ

کہوں کس سے میں یہ جا کر مری قومِ بدگلو نے ــــ مجھے قتل کر کے چھوڑا بہ گناہِ خوش نوائی

ان کا ایک آخری زمانے کا شعر ہے جو آنے والے زمانے کے نقادوں کے لئے ایک چیلنج ہے ــــ

میں کثرتِ ظہور سے نادیدنی ہوں جوش ــــ میں شدتِ وجود سے ناآفریدہ ہوں

یہ شعر دیوانِ غالب یا دیوانِ شمس تبریز میں آسانی سے شامل کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے ایک نوجوان شاعر اور ہندوستان میں حیدر آباد کے اختر حسن صاحب نے جوش کی تاریخ وفات اسی کی رباعی کے ایک مصرعے میں تلاش کی ہے ؎

میں شاعرِ آخر الزماں ہوں اے جوش

جوش پر اردو شاعری کا کلاسیکی دور ختم ہو جاتا ہے اور انھیں کی شاعری سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔

سردار جعفری۔ بمبئی

یادش بخیر

جوش کی شاعری کی قدر و قیمت کو متعین کرنا کچھ آسان نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا حجم بہت زیادہ ہے۔ ان کی شاعری مختلف اصناف پر پھیلی ہوئی ہے۔ مگر اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہے کہ جس طویل انقلاب کی زد میں ہماری زندگی گذشتہ دو سو سال سے، یعنی جب سے انگریزوں نے قدم جمائے ہم اپنی زندگی کی پرانی حقیقت سے مسلسل جنگ کرتے رہے ہیں کبھی آگے بڑھتے ہیں تو کبھی پیچھے بھی ہٹتے ہیں۔ لیکن وہ جنگ جاری ہے اور جاری رہے گی۔ جب تک کوئی بنیادی تبدیلی معاشرے کی ہیئت اجتماعی اور ہماری فکر اور نفسیات کی دنیا میں پیدا نہ ہو۔ یوں تو ہر انقلاب کے بعد ایک انقلاب ہے اور زندگی کا سفر غیر مختتم ہے۔ لیکن میں جس طویل انقلاب کی بات کر رہا ہوں۔ اس کا تعلق اس انقلاب سے ہے جو ہمیں فیوڈل سماجی حقیقت اور فیوڈل ذہن سے باہر نکال کر جدید عہد میں لائے گا۔ ہم نے اس طویل انقلاب میں کئی منزلیں طے کی ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ہم اس انقلاب کے نقطہ اختتام تک پہنچ گئے ہیں۔

چنانچہ اس پس منظر میں جوش کی شاعری کا ہماری زندگی سے ایک زندہ رشتہ ہے۔ انھوں نے اپنے نعروں سے اپنی مردہ قوم کو جھنجھوڑا اور جگایا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے خطیبانہ انداز اور اس کی بلند آہنگی۔ ان دونوں کمزوریوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ لیکن وہ اس کا جواز اسی بات میں ڈھونڈتے کہ یہ قوم نازک اور سبک اشاروں سے جاگنے والی نہیں ہے۔ نئی نسل جوش کی ان توجیہات کو قبول نہیں کرتی ہے۔ اس لئے جوش سے اس کی دلچسپی کم ہے اسے جوش کا اسلوب شعر پسند نہیں ـــــ

روسو نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے یونان اور روم کی تہذیب میں تحریر فکر سے جدا نہ تھی جہاں تحریر ہوتی وہاں فکر ہوتی۔ مگر مسلمانوں نے اپنے علم انشا سے فکر کو تحریر سے جدا کر دیا۔

یہ بات روسو نے کچھ تعصب کی بنیاد پر نہیں کہی ہے۔ تاریخ یہ ہی کہ مسلمانوں نے علم انشا کو ترقی دی۔ انھوں نے انشا کو ایک ایسے فن میں تبدیل کر دیا کہ عبارت کے لئے فکر کوئی لازمی شے نہیں رہی۔ اس قسم کا انشا فارسی زبان میں خاص طور سے ملتا ہے۔ اور اس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس انشا پردازی کا اثر جسے درباری زندگی نے جنم دیا تھا۔ ہماری درباری شاعری پر بھی پڑا اور پھر اس کا عمومی اثر ہماری شاعری پر۔ ہمارے شعرا ہمیشہ الفاظ کے معاملے میں مسرف رہے ہیں۔ مدح سرائی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے خزانوں کو لٹانا وہ منجملہ محاسنِ شعر تصور کرتے۔ جہاں جوش کی نثر پر ہماری اس انشا پردازی کا اثر ہے وہاں ان کی شاعری بھی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا۔

جوش کی شاعری حتیٰ کہ اقبال کی شاعری کو بھی نئی نسل کے شعرا نے جدید شاعری کا نام نہیں دیا۔ کیونکہ جدید شاعری انشا پردازی سے لفظ کے اسراف سے، خطابیات سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے۔ اس پر مغرب کا اثر غالب ہے۔ اس سے انکار نہیں۔ لیکن اب اثر مغرب کوئی بدعت نہیں ہے۔ یہ چند اشارات میں نے اس لئے مہیا کر دیئے ہیں کہ اس بات کو سمجھا جا سکے کہ ایسا کیوں ہے کہ باوجود اس بات کے کہ جوش اتنے اہم اور بڑے شاعر تھے۔ نئی نسل کو ان کی شاعری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کا تعلق ان کے خیالات سے کم، ان کے اسالیب سے زیادہ ہے۔ کیونکہ نئی نسل کچھ ان سے کم باغی نہیں ہے۔

(پروفیسر ممتاز حسین۔ پاکستان)

جوش کی شاعری کے کینوس پر پھیلی ہوئی رنگ دیو اور تلاش و جستجو کی ایک دنیا، ایک عالم آباد ہے۔ اس میں امیر، غریب، بچے، مرد، عورت، جوان، بوڑھے مختلف پیشوں کے لوگ گوالے، جامن والی تاجر، صنعت کار، مزدور، عالم، جاہل، مولوی، حجرے، مسجدیں، منادر، دریا گھاٹ، جنگل پہاڑ، چاندنی اور تاریک راتیں، گھر گلیاں، آنگن محل، محل سرائیں بوسیدہ اور زمیں بوس عمارتیں، جاگتی جگمگاتی سڑکیں، فیشن ایبل علاقے، تنگ و تاریک مزدوروں کی بستیاں، طوائف اور ان کے بالا خانے، کیا کچھ نہیں ہے؟ پھر آدمی کے حوالے سے اس کی مختلف النوع مزاجی کیفیات، مثلاً ہنستا کھلکھلاتا آدمی، روتا بسورتا ہوا آدمی، فطرت بہار اور وقت کے دھاروں پر بہنے والا آدمی، فطرت کے خلاف جنگ کرتا ہوا آدمی، ظالم، مظلوم، حاکم، محکوم، بوسیدہ لباس میں سچا اور کھرا آدمی، زربفت کے غلافوں میں لپٹا ہوا ریاکار اور فریبی آدمی

غرض جیتا جاگتا ایک ہجوم ہے جو جوش کی شاعری میں کچھ یہاں کچھ وہاں بکھرا پڑا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا کوئی تخلیقی فن پارہ آدمی اور اس کے مسائل، اس کی ضروریات زندگی کے لئے ترستی ہوئی دل کو تڑپا دینے والی دردناک تصویر نہ پیش کرتا ہو۔ لیکن ایسی بھی لاتعداد نظمیں ہیں، جن میں اس آدمی کا دوسرا رخ 'خوش باش، سرمست، زندگی کی مسرتوں کو سمیٹتے ہوئے بھی ملتا ہے۔ پھر بظاہر فطرت کی ایسی ولولہ انگیز تصویر کسی کی شاعری ہے جس کو دیرانوں میں بیٹھا ہوا آدمی پڑھے تو اس کے گرد و پیش، کلیوں کے چٹکنے کی آواز، شگوفوں کے کھلتے ہوئے لمحوں کی وہ خوشبو جو مشام جان کو معطر کردے۔ گھٹاؤں کے اودے اور کالے کالے رنگ، بجلی کی تڑپ آسمان اور بادل گرجنے کی ہیبت ناک آوازوں سے لبریز ماحول میں تبدیل ہونے لگے۔ جوش کی شاعری کا یہ کمال ان کی ذات پر ختم ہے۔ بیسویں صدی کا کوئی شاعر محاکات کی شاعری میں ان کا ہمسر اور ہم پلہ نہیں —

(عتیق احمد۔ پاکستان)

جوش نے اردو شاعری کو اس درجہ مالا مال کیا ہے کہ وہ زبان کو مالا مال کرنے کے باب میں قلی قطب شاہ، نظیر اکبرابادی اور میر انیس کی صف میں آکھڑے ہوئے ہیں۔ اردو شاعری میں جوش اور انگریزی شاعری میں ملٹن کے ساتھ ایک عجیب معاملہ یہ ہے کہ یہ دونوں شعری زبان کے جملہ امکانات کھنگالتے ہوئے نظر آتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ جوش زبان پر اپنی بھرپور قدرت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ وہ زبان کے طمطراق سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی فکر کی سچائی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ وہ غزل کی روایت میں طویل فکری نظموں کے لئے راہ ہموار کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کے سینئر ہمعصر اقبال نے بھی یہی طریقہ کار اپنایا تھا۔ عجیب بات ہے کہ جوش کے لئے ان کے بعض جدید ہمعصروں نے وہی سب کچھ کہا جو ایلیٹ اور اس کے ہم نواؤں نے ملٹن کے بارے میں کہا تھا۔ یہی کہ ملٹن کے یہاں زبان کی گھن گرج کے علاوہ اور کیا ہے۔ لیکن جس طرح ایلیٹ مآل کار اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کے لئے مجبور ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے خیال پر نظر ثانی کرتے ہوئے ملٹن کی "عظمت" تسلیم کی۔ بعینہٖ اسی انداز میں جوش کی عظمت کا اعتراف کیا جارہا ہے۔ بس زوائد کی شکایت پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ لیکن اگر ان زوائد کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لئے گنجائش پیدا کرلی جائے تو پھر جوش کی عظمت کے اعتراف میں آخری رکاوٹ بھی دور ہوسکے گی۔

(محمد علی صدیقی۔ پاکستان)

وحید اختر

سخن گسترانہ بات

زندگی تو متنازعہ ہے ہی، موت بھی متنازعہ فیہ بن سکتی ہے۔ جوش کی موت پر حفیظ جالندھری نے بیان دیا کہ جوش کو بہت پہلے مرجانا چاہیئے تھا۔ گویا شعرائے ہندوپاک کی درازیٔ عمر و قضا کا فیصلہ مسبّب الاسباب نے حفیظ صاحب کے سپرد کر رکھا ہے اور جوش ان کی مقرر کی ہوئی مہلتِ عمر سے زیادہ دنیائے آب و گل میں رہ لئے۔ جوش کا یہی ایک گناہ نہیں، ان کا جو اعمال نامہ حضرت حفیظ کے پاس محفوظ ہے، اس کی بنا پر انھوں نے یہ فیصلہ بھی صادر فرمایا کہ اب جوش اپنے زندگی بھر کے گناہوں کی سزا دوسری دنیا میں بھگت رہے ہوں گے ـــــ یعنی حفیظ صاحب صرف اس دنیا ہی میں ایک شاعر کی زندگی کے ماہ و سال کے شمار پر مامور نہیں، اس کے اعمال کی سزا و جزا کا آخرت میں بھی فیصلہ وہی فرماتے ہیں۔ جوش کو علم ہوتا کہ کراماً کاتبین کے علاوہ ایک تیسرا موزوں طبع فرشتہ بھی ان کی اعمال کی کتابت کر رہا ہے تو شاید وہ اپنے اعمال و عقائد کے بر ملا اعلان میں کچھ محتاط رہتے۔ حفیظ کے اس بیان پر خود پاکستان کے کئی ادیبوں اور شاعروں نے مذمتی بیان جاری کیا۔ ہندوستان کے اردو، حلقوں میں بھی اس کا ردِّ عمل ہوا کیونکہ لوگ اپنے بدترین دشمنوں کو بھی ان کے مرنے کے بعد معاف کر دیتے ہیں یا مرنے والے نے جو ظلم کیا ہے، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے خاموش ہو رہتے ہیں۔ حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی اللہ اور بندے کے مابین معاملہ ہے، اگر جوش نے شعایر مذہب کی پابندی اس طرح نہیں کی، جس طرح حفیظ صاحب چاہتے تھے، تو یہ معاملہ اللہ اور جوش کے درمیان ہے، جوش و حفیظ کا معاملہ نہیں ـــــ حقوق الناس کی ادائیگی میں شاید جوش سے سب سے بڑی کوتاہی یہ ہوئی کہ انھوں نے حفیظ سے بہتر شاعری عمر کے ہر حصے میں کی ـــــ جوش کو کوئی ناظم ہی کیوں نہ کہے، ان کی قوت نظم کا اظہار پست سطح پر بھی شاہنامے کی قافیہ پیمائی سے بہتر ہی رہا ـــــ جوش حفیظ سے بہتر شاعری کر کے ہندوستان میں ہی رہتے، پاکستان ہجرت نہ کرتے تو شاید حفیظ کو ان کی زندگی کی درازی کا اتنا قلق نہ ہوتا۔ جوش سے

پاکستان جانے کے بعد بھی سب سے زیادہ غم و غصہ کا اظہار حفیظ ہی نے کیا تھا۔ یہ ان کے اعتماد کی کمی اور فن کی کمزوری تھی جو جوشؔ کے ورودِ پاکستان سے ہراساں تھی۔ وہی کمزوری جوشؔ کی موت پر غصے کی شکل میں پھر مشتہر ہوئی۔

جوشؔ پاکستان کیوں گئے؟ ان کا عذر تھا کہ اپنے اہل و عیال کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ جوشؔ سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی نے سکونتِ پاکستان اختیار کی، اور ان کے بعد نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری ایسے ادیبوں نے ہجرت کی۔ ان کے ترکِ وطن میں ذاتی اسباب اور خانگی مجبوریاں کارفرما تھیں ــ لیکن جوشؔ کا معاملہ مختلف تھا، وہ ذمہ دار عہدے پر مامور تھے، وزیر اعظم اور دوسرے اکابر تک ان کی رسائی اور اثر تھا۔ وہ زندگی بھر نظریۂ پاکستان اور فرقہ وارانہ سیاست کے مخالف رہے تھے۔ ہندوستان کو چھوڑنا آسان ہو تو ہو، اپنے ماضی کو ترک کرنا ممکن نہیں ـــــ جوشؔ کا ماضی ان کے ساتھ رہا اور پاکستان میں انھیں وہ سب کچھ نہ ملا جس کی انھیں امید تھی وہ عزت و رسوخ جو ہندوستان میں انھیں میسر تھے، وہاں کبھی ان کے حصے میں نہ آئے "یادوں کی برات" ان کے اس شکوے کا خود نوشت دفتر ہے۔ جوشؔ سے اگر شکایت تھی تو ہندوستان کی حکومت، مسلمانوں اور ارار دو والوں کو، لیکن سب نے انھیں معاف کر دیا۔ ان کی موت پر ہندوستان کے صدر اور وزیر اعظم نے بھی پیامات تعزیت بھیجے۔ ہندوستان کے رسائل دھڑا دھڑ نمبر نکال رہے ہیں۔ کراچی میں ان کی یاد میں جو مشاعرہ ہوا وہ بھی جوشؔ کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ حالانکہ جوشؔ کی شاعری کا رنگ ترکِ وطن کے بعد پھیکا پڑ چکا تھا، اور نئے رجحانات و تجربات کی یورش نے ان کی ہم عصر معنویت و اہمیت کو بڑی حد تک گھٹا دیا تھا ـــــ اس معاملے میں فراقؔ زیادہ خوش قسمت تھے کہ وہ تادمِ آخر عصری احساس و فکر کے ترجمان مانے جاتے رہے، اس کا ایک سبب تو دونوں کے وسائلِ اظہار کا فرق ہے۔ غزل کی اشاریت و رمزیت سیاسی و سماجی مسائل کو استعاروں کی زبان میں اپنے عصر سے ماورا بنا کر اسے ہر بدلتے ہوئے میلان سے ہم آہنگ رکھتی ہے۔ جوشؔ کی نظمیہ شاعری کا بڑا حصہ براہِ راست برہنہ اظہار ہونے کی وجہ سے وقتی اہمیت رکھتا تھا۔ ان کے اسلوب اور نظموں کی ریل پیل میں معنی کی وہ سطح جو 'ماورائے سخن' ہوتی ہے پامال ہو جاتی تھی، لیکن یہ بات ان کی پوری شاعری کے لئے صحیح نہیں ـــــ ان کی شاعری کا جمالیاتی عنصر، طنزیہ لہجہ، اور نظموں پر ان کی خلاقانہ دسترس اردو شاعری کے سرمایے میں آج بھی اضافہ ہیں۔ وہ عظیم نہ سہی، بہت اہم شاعر تھے، اور رہیں گے۔ فراقؔ کی موت سے غزل کی کلاسیکی روایت

ختم نہیں ہوئی، اس لئے کہ غزل جدید سے جدید تر قالب میں بھی کلاسیکیت سے یکسر منقطع نہیں ہوسکتی
جوش کی موت سے نظم کی وہ کلاسیکی روایت جو نظیر، انیس اور ایک حد تک اقبال کے اسالیب میں کمال
کو پہنچی تھی، ختم ہوگئی۔ جدید نظم کلاسیکی روایت اور لہجے سے بہت مختلف ہو چکی ہے۔ اور یہ انحراف
وقت کے ساتھ ساتھ کم نہیں ہوگا بڑھتا جائے گا۔ اس لحاظ سے جوش کو اردو کا آخری کلاسیکی شاعر
کہا جا سکتا ہے۔ ان کی موت کے بعد ان سے عقیدت و محبت کا اظہار اپنی کلاسیکی روایت کے
احترام کا ثبوت ہے۔ جوش کے منکر کلاسیکی روایت سے ناآشنا ہیں، اس لئے اپنے انکار میں
تصور دار نہیں۔

حفیظ جالندھری کسی لحاظ سے کبھی بھی جدید حیثیت کے شاعر نہیں رہے، ان کی شاعری
نظم میں ہو یا غزل میں یا گیت میں، ایک عہد میں غیر معمولی مقبولیت کے باوجود بڑی حد تک روایتی
رسمی رہی۔ ان کا اسلوب اور لہجہ کلاسیکی روایت سے ماخوذ ہے، مگر خود کلاسیک کا درجہ حاصل نہیں
رسکا جب کہ جوش کو زندگی ہی میں کلاسیک کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ دونوں کا یہ فرق خود مذہبی
شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ حفیظ کا شاہنامۂ اسلام کمزور شاعری اور پھس پھسی قافیہ پیمائی ہے
س سے قطع نظر کہ اسلام کی تاریخ کو شاہنامے کا عنوان دینا بجائے خود اسلام کی جمہوری اور انقلابی
روح کی نفی ہے۔ ایران کی تاریخ کو شاہنامہ کہنے میں فردوسی حق بجانب تھا لیکن اسلام کا
شاہنامہ لکھنا اسلام کی تعلیمات سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اس کے مقابل میں جوش کی نعتیں،
سلام اور مرثیے یا مسدس، خصوصاً حسین اور انقلاب، اسلام کی انقلابی روح، انکار شاہی اور
حق دوستی کے ایسے فنی اظہارات ہیں جو جدوجہد آزادی کے دور سے آج کی جمہوری تحریکوں تک
نئے معنویت و وقعت رکھتے ہیں۔ جوش نے کچھ رباعیات میں مذہبی فکر کا مذاق اڑایا ہے۔
رسی اور اردو شاعری میں جامد مذہبی فکر و شعائر نے کہیں کہیں حدِ ادب کو پار کیا اور اس کی
بہ سے کبھی کبھی مطعون بھی ہوئے۔ آزادی سے قبل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مشاعرے
ب ان کے اشعار پر احتجاج ہوا تھا، اور انھوں نے آگے شعر سنانے سے انکار کر دیا تھا۔ جوش
شخصیت بجائے خود اتنی مستحکم اور پرشکوہ تھی کہ ان کے ساتھ کوئی وہ سلوک کرنے کا تصور
ی نہ کر سکتا تھا جو یگانہ کے ساتھ بدقسمتی سے ہوا۔ یگانہ کو جوش کی سی شخصیت، مقبولیت
صل نہ تھی حالانکہ ان کا شاعرانہ رتبہ اپنے بیشتر معاصرین سے بلند تر تھا۔ باوجود اس کے
جوش نے کہیں کہیں مذہبی عقائد سے کھلواڑ کیا ہے، ان کی شاعری کو ملحدانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان

کی ابتدائی مذہبی حسیت، رسولؐ، اسلام، حضرت علیؓ اور امام حسینؓ، شہدائے کربلا سے ان کی جذباتی و ذہنی عقیدت کسی دور میں ان کی شاعری سے الگ نہیں ہوئی ــــــ جوش کی فطرت سے وابستگی اور خصوصیت سے ظہور صبح کے مناظر سے انہیں جو روحانی تجربہ حاصل ہوتا تھا، اس کی نمائندگی کے لئے ابتدائی دور کا ان کا یہ شعر ہی کافی ہے ؎

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

ان کی مذہبی حسیت ان کے جمالیاتی تجربے پر مبنی تھی ــــــ یہ ماننا پڑے گا کہ جو اس کی سطح کے جمالیاتی تجربے کو اردو کے کسی اور شاعر نے جوش سے زیادہ خوبصورت شاعرانہ زبان عطا نہیں کی۔ یہ تجربہ اس کی سطح سے اٹھ کر روحانی تجربہ بن گیا ہے، وہاں جوش کی شاعری عظمت کی حدوں کو چھو لیتی ہے، حنیفہ مذہب کے ظاہر سے کتنی ہی وابستگی ظاہر کریں، وہ مذہبی شاعری میں بھی جوش کی اس سطح تک کہیں نہیں پہنچ سکے ــــ کیا اعمال کے محاسبے میں اچھی اور بری شاعری کی کوئی جزا و سزا نہیں؟

فراقؔ کا شوق تھا کہ ان کے متعلق ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہا جاتا رہے ــــ انھوں نے انگریزی اور اردو میں خود اپنے متعلق دوسرے ناموں سے بھی لکھا ــــ اپنے ایسے خطوط بھی چھپوائے جن کا مواد متنازع فیہ تھا ــــ جوش کو اس طرح موضوع بحث بننے کا شوق نہ تھا۔ لیکن ان کی فقرے بازی اور غیر محتاط تحریروں نے انہیں اکثر بحثوں ہی کا نہیں، بلکہ حملوں کا ہدف بھی بنایا۔ نیاز فتحپوری نے ان کی کسی بات سے ناراض ہوکر ان کے خلاف تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور علی اختر حیدرآبادی کو ان سے کامیاب نظم گو ثابت کرنے کی ناکام سعی کی۔ نیاز صاحب کے تنقیدی قلم سے اس دور کے اکابر غزل گو بھی نہ بچ سکے۔ یہ نیاز کی کمزوری تھی کہ وہ زبان کی اغلاط کی نشان دہی کے ساتھ اصلاح بھی دے دیا کرتے تھے۔ زبان، عروض اور فن جاننا ایک بات ہے اور اچھا شعر کہنا دوسری بات۔ جوش کی شہرت و مقبولیت پر ان تنقیدوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جب وہ ترقی پسندوں کے سرخیل و قبلۂ و کعبہ بنے تو ترقی پسندی کے خلاف اعتراضات کا رُخ ان کی طرف بھی ہوا۔ ان کی انقلابی شاعری کو "کف در دہاں" ہیجان کہا گیا ــــ لیکن خود جوش "کف در دہاں" نعروں سے بیزار ہوئے تو ایشیا کی بیداری کی نمائندہ نظموں کے انتخاب "شکست زنداں"[1] پر ایک نظم کہہ ڈالی اور مرتب کو یوں نوازا

آفریں بر غلام ربانی کیا غلط ہے مینڈکوں کا جلوس

[1] مرتبہ غلام ربانی تاباں

یہ جوش کی شخصیت کا سحر تھا کہ اس کے باوجود ترقی پسند شعرا ان کا انکار نہ کر سکے۔

پاکستان میں افکار نے جوش نمبر نکالا۔ نذیر احمد کی زبان پر جوش کی اصلاح سے خفا ہو کر شاہد احمد دہلوی نے ساقی کا ضخیم جوش نمبر ان کے خلاف مضامین جمع کر کے شائع کیا۔ جوش کے ناقدین میں روایتی شاعری کے پرستار ترقی پسندوں کے مخالفین، مذہب اور پاکستان کے مویدین و مجاہدین کے ساتھ کچھ سنجیدہ ادیبوں کے نام بھی اس نمبر کے لکھنے والوں میں ہیں۔ ان میں سب سے اہم مضمون خلیل الرحمٰن اعظمی کا ہے، جو اس سے قبل 'فکر و نظر' علی گڑھ کے پہلے شمارے میں شائع ہو چکا تھا ــــ اس رسالے کے مدیر تو رشید احمد صدیقی تھے، جن سے علی گڑھ کے مشاعرے میں جوش کی چھیڑ چھاڑ ہوئی تھی، لیکن مجلس ادارت میں اوروں کے ساتھ ڈاکٹر عبدالعلیم کا بھی نام تھا ــــ اس لئے خلیل کے مضمون کی اشاعت کو محض مخالف ترقی پسند میلان کا نمائندہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ خلیل کی تنقید شواہد و دلائل پر مبنی ہے، ان کے اعتراضات بے بنیاد نہیں ــــ جوش کی صرف طنزیہ شاعری ان کی شدید تنقید کے حملے سے محفوظ رہی۔ جوش نے کسی رسالے میں اس کا مختصر سا غیر سنجیدہ جھنجھلایا ہوا جواب بھی لکھا تھا ــــ لیکن خود ساقی کا جوش نمبر اچھی تنقید کا نمونہ نہیں، شخصی مخاصمت اختلافات کا آئینہ دار ہے۔ اس کے جواب میں جوش نے شاہد احمد دہلوی اور ان کے بعد ڈپٹی نذیر احمد پر شخصی حملے کئے ــــ

جوش نمبروں کا ہنگامہ ٹھنڈا پڑا ہی تھا کہ "یادوں کی برات" آگئی ــــ اس کتاب پر بھی خاصی لے دے ہوئی۔ لیکن ایک بات کا اعتراف مخالفین کو بھی کرنا پڑا کہ نظمیہ شاعری میں زبان کی قدرت کا جو مظاہرہ جوش کے یہاں ہوتا ہے، نثر میں بھی انھوں نے اس کا حق ادا کر دیا۔ جوش کی زبان و اسلوب پرانا ہے لیکن اس میں جو قوت ہے شخصیتوں، واقعات اور مکالموں کی ادائیگی میں پوری طرح بروئے کار آئی ہے ــــ اس خود نوشت میں جوش نے اپنے خاندان، بچپن، جوانی اور معاشقوں کو تخئیل آفرینی سے خوب رومانیا کر پیش کیا ہے۔ دوستوں کے ذکر میں باستثنائے چند اکثر کے مضحک پہلوؤں اور کمزوریوں کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نظام حیدر آباد ایسے مطلق العنان جلیل القدر حاکم کے سامنے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش برابر کے حریف ہیں۔ یہ محض مبالغے میں ــــ اپنے عشقوں کی گنتی گنانے میں اور اپنی 'محبوبیت' کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں وہ حقیقت اور توازن سے رشتہ توڑ بیٹھے ہیں اس کتاب پر اس کی اشاعت کے فوری بعد میں نے 'ہماری زبان' میں تفصیلی تبصرہ کیا تھا، اس لئے اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ محل نہیں ــــ صرف اتنا اشارہ

کافی ہے کہ جوشؔ نے خود انھیں کی آنکھ سے اپنے کو جس طرح عمر بھر دیکھا "یادوں کی برات" اسی کی تصویر ہے۔ جوشؔ، سیاسی تحریک سے وابستہ رہے لیکن اس کتاب میں تحریک آزادی، ترقی پسندی، تقسیم، فسادات کسی کا ذکر نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعرِ انقلاب تمام ہم عصر انقلابوں سے بے تعلق اور بیزار رہے۔ یہی رویہ ان کی انقلابی شاعری کو کمزور کرتا ہے۔ انقلاب بھی ان کے رومانی مزاج اور نرگسیت کے لئے محض ایک آئینہ ہے جس میں وہ اپنے اور اپنی شاعری کے خط و خال کو دیکھتے اور چمکاتے رہے۔

روسو کی اعترافات، ایک عہد آفریں خود نوشت تھی، بے باک اور عریاں حقیقت نگاری اور بر خود غلط خود احتسابی کا صحیفہ۔ روسو نے بھی اپنے معاشقوں کی تفصیل لکھی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محبت اس کے لئے ضروری تھی اور عورت جذبۂ رفاقت کا لازمہ۔ جوشؔ کے یہاں محبت روحانی جذبہ ہے نہ جذبۂ رفاقت، وہ اس کی جسمانی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکے۔ نہ انھوں نے روحانی کرب محسوس کیا جو زندگی بھر روسو کا مقدر رہا۔ عدم تکمیل کا احساس روسو کے "اعترافات" پر حاوی ہے۔ جوشؔ نے مکمل اور بھرپور زندگی گزاری اور وہ کبھی عدم تکمیل کے اس تجربے سے دوچار نہیں ہوئے جو نہ صرف سماج و سیاست بلکہ فرد کی زندگی کے لئے بھی انقلاب کا سرچشمہ بنتا ہے۔ "اعترافات" "یادوں کی برات" میں معاشقوں کا بیان بھی مختلف ہے۔ جوشؔ نے مزے لے کر انھیں سلسلہ وار الگ عنوان کے تحت گنایا ہے جب کہ روسو نے انھیں اپنی زندگی کے بہاؤ سے الگ نہیں رکھا، اسی لئے وہ اس کے داخلی تجربات اور جذباتی ضرورت کا لازمی حصہ معلوم ہوتے ہیں — تین چیزیں "اعترافات" اور "یادوں کی برات" میں مشترک ہیں، فطرت سے زیادہ وابستگی، حد سے زیادہ جذباتیت، جنسی نمائش پسندی۔ روسو مغرب میں رومانیت کی تحریک کا نقیب ہے، اور فطرت سے اس کی محبت سماجی تبدیلی کے فلسفے تک پہنچتی ہے۔ جوشؔ کے یہاں فطرت کی محبت حواس کی جمالیاتی سطح تک محدود رہتی ہے وہ اسے سماجی تبدیلی کے قبول کر دہ انقلابی فلسفے سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ یہی ان کی شاعری میں فکری عنصر اور وجودی تجربے کی خامی کا سبب ہے۔ روسو کے زندگی اور خود نوشت میں "جنونِ سازش شکاری" ہے جو دیوانگی کی حد پر ختم ہوتا ہے۔ جوشؔ کے یہاں لذت کوشی کا رجحان ہے۔ "اعترافات" بیانِ صفائی ہے۔ "یادوں کی برات" خود پسندی نشاط کوشی کی داستان۔ روسو اور جوشؔ دونوں کے یہاں بچپن سے جنسی نمائش پسندی کا سراغ ملتا ہے رقیق جذباتیت جو روسو کے اعترافات میں ہے جوشؔ کے خطوط میں

تک مل جاتی ہے۔ شانتی نکیتن سے اپنی ، سالہ بیٹی سعیدہ کو لکھتے ہیں :

"دُکھیا باپ کا خط اس کی ہفت سالہ لڑکی کے نام ـــــ سعیدہ پیاری!
میں نے تیری ماں کا خط پڑھا جس میں لکھا تھا کہ تیرے پاس اب کپڑے بھی نہیں رہے۔ گرمی کی شدت ہے اور موٹے کپڑے پہنتے وقت تو رونے لگتی ہے۔
آہ تیرے باپ کی بے کسی! اب وہ اپنی بیٹی کو گرمیوں کا لباس بھی نہیں پہنا سکتا
بیٹی یہ خبر، پردیس میں تیرے باپ نے سنی عین اس عالم میں کہ فکریں اس کے دل کو سانپ کی طرح ڈس رہی تھیں.... اور وہ گھبرایا ہوا تھا۔"
"پیاری سعیدہ! تیرا مصیبت زدہ باپ یہ دکھ بھول نہیں سکتا، اس خبر کا داغ اس کے ساتھ قبر میں جائے گا۔ سن تیرا باپ وصیت کرتا ہے کہ اس مبارک دن جب وہ مر جائے تیری اس خراب پوشاک کی یادگار میں اسے ایسے ہی موٹے کپڑے کا کفن دیا جائے۔"

(بحوالہ عصمت ملیح آبادی، قومی آواز، لکھنؤ)

جوش کی جاگیرداری اور زمین داری کے دعووں کی روشنی میں یہ واقعہ اور خط دونوں مبالغہ آمیز جذباتی التباسات معلوم ہوتے ہیں۔ رومانیت کا یہ رویّہ ادب ہی میں نہیں زندگی میں بھی التباس کا سہارا لیتا ہے ـــــ وطن اور دوستوں کی یاد، عہدِ گزشتہ اور گم شدہ جوانی کے ذکر میں بھی جوش کا انقلابی مزاج رومان زدہ ماتم و فریاد کا شور بن جاتا ہے۔ اس کے برخلاف روسو کی غربت و محرومی کچھ تو اس کے حالات کا نتیجہ ہے اور کچھ خود عائد کردہ۔ اس نے بچپن میں گھر چھوڑا زندگی بھر کا بن باس لیا۔ مقبولیت کے عروج کے زمانے میں شہنشاہِ فرانس کی حضوری اور وظیفہ قبول نہ کیا۔ اس کے باوجود اس کے یہاں غربت و مجبوری کا نوحہ کہیں نہیں، اگر نوحہ و نالہ ہے تو اپنی جذباتی تشنگیوں کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رومانیت تصویرِ مرگ کو بھی جذبۂ ترحم کے ابھارنے کا وسیلہ بنا دیتی ہے۔ عنفوانِ شباب ہی سے روسو بار بار اپنی قریب آتی مفروضہ موت کا ذکر کرتا ہے، جوش کے خطوط اور تحریروں میں بھی موت کو جگہ جگہ خوش آمدید کہنے کا جذبہ نمایاں ہے لیکن محض ہمدردی و رحم کو ابھارنے کے لئے، یہ حقیقی جذبہ معلوم نہیں ہوتا۔ جوش میں شہیدوں کی شان نہ تھی، نہ شہادت ان کا مقدر تھی ـــــ آخر عمر میں حیدرآباد کا رُکا ہوا وظیفہ حکومت آندھرا پردیش نے ان کے لئے جاری کر دیا جائے کے تیس ہزار روپے ان کے

کھاتے میں جمع ہوئے۔ جنرل ضیاءالحق کی حکومت بھی انھیں ماہانہ بارہ ہزار کا وظیفہ اور دوسری سہولتیں دیتی رہی ـــــ جوش اپنی فطرت پرستی اور عشق پیشگی کے باوجود رو سو نہ تھے اس لئے کہ ان کے یہاں فطرت اور عشق کا تجربہ اس انقلابی مفکر سے بہت مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ اسی لئے 'یادوں کی برات' کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ یہ اپنے دور کے ایک بڑے قادر الکلام شاعر کی زندگی کا خود نوشت بیان ہے جو کسی گہری روحانی واردات سے یکسر مبترا ہے۔ ان خامیوں کے باوجود جوش کی نثر ان کے منفرد اور جاندار اسلوب کا ایسا کارنامہ ہے جسے مدتوں دلچسپی کے ساتھ لغات کے ایک بیش بہا ذخیرے کے طور پر پڑھا اور استعمال کیا جائے گا۔

جوش کی شاعری کی اہمیت ان کی نثر سے کہیں زیادہ ہے۔ فراق اگر زندگی بھر کسی کو اپنا حریف سمجھتے رہے تو وہ محض جوش تھے۔ ترقی پسندوں نے اگر کسی کو آخر وقت تک "قبلۂ رندانِ جہاں" مانا تو وہ صرف جوش تھے ـــــ مخالف ترقی پسند نظریات رکھنے والوں اور جدیدیت کے کچھ میلانات کے طرف داروں کو اگر کوئی مناسب ہدف ملامت ملا تو وہ جوش ہی تھے ـــــ پرستش اور سنگ باری دونوں دیو قامت شخصیتوں کے حصے میں ہی آتی ہیں ـــــ جوش سے زیادہ ان کے کسی ہم عصر کو مقبولیت و شہرت ملی نہ ان سے زیادہ کوئی ہدفِ ملامت بنا، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جوش ہمارے عہد کی بڑی شخصیت تھے۔ اگر ان کی شاعری کا سختی سے اچھا انتخاب کیا جائے تو ان کے شاعرانہ مرتبے کو متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے ـــــ اپنی کمزوریوں کے باوجود جوش اردو کے اہم شاعروں میں ہمیشہ جگہ پائیں گے ـــــ ان کی کمزوریاں بھی ادب میں فیشن بنیں اور ان کی خطابت و لفظیات کی بھی برسوں تقلید ہوتی رہی۔ رباعی میں وہ اردو کے سب سے بڑے نہیں تو چند بہترین شاعروں میں ضرور ہیں، اسی کے ساتھ ان کی طنزیہ شاعری ہی نہیں جمالیاتی تجربے اور جسمانی عشق کی شاعری بھی اردو کے سرمایے میں منفرد ہے اور رہے گی ـــــ طنز و خوش مذاقی بڑے ادب کا ایک لازمی عنصر ہے، اس عنصر نے جوش کو وقتی اہمیت کا شاعر ہونے سے بچا لیا۔

جوش کی موت سے واقعی اردو ادب کا ایک دور ختم ہو گیا ـــــ نظم جوش سے کتنی ہی آگے بڑھ چکی ہو، جوش کی نظم کا نہ سہی، بحیثیت مجموعی ان کا قد اب بھی اس دور کے شعرا میں سب سے اونچا ہے۔ قد کی یہ بلندی محض شاعری کی دین نہیں، شخصیت کا بھی اثر ہے۔ اب یہ امکان نہیں کہ جوش کی ایسی با اثر شخصیتیں اردو میں پیدا ہو سکیں ـــــ جوش نے خود کہا تھا ؎

بِشہ الحمد کہ قوم شعرا میں لے جوش ۔۔۔ مجھ سا کافر نہ اٹھا کوئی مسلمانوں میں

اس دعوائے کافری کے لئے جس قوتِ ایمانی کی ضرورت ہے اس کا اندازہ حفیظؔ صاحب کو نہیں ہو سکتا۔ ◻